سامراج کے مقابل

اقبال احمد کے تین انٹرویو

ڈیوڈ برسیمین

ترجمہ: حمید جہلمی

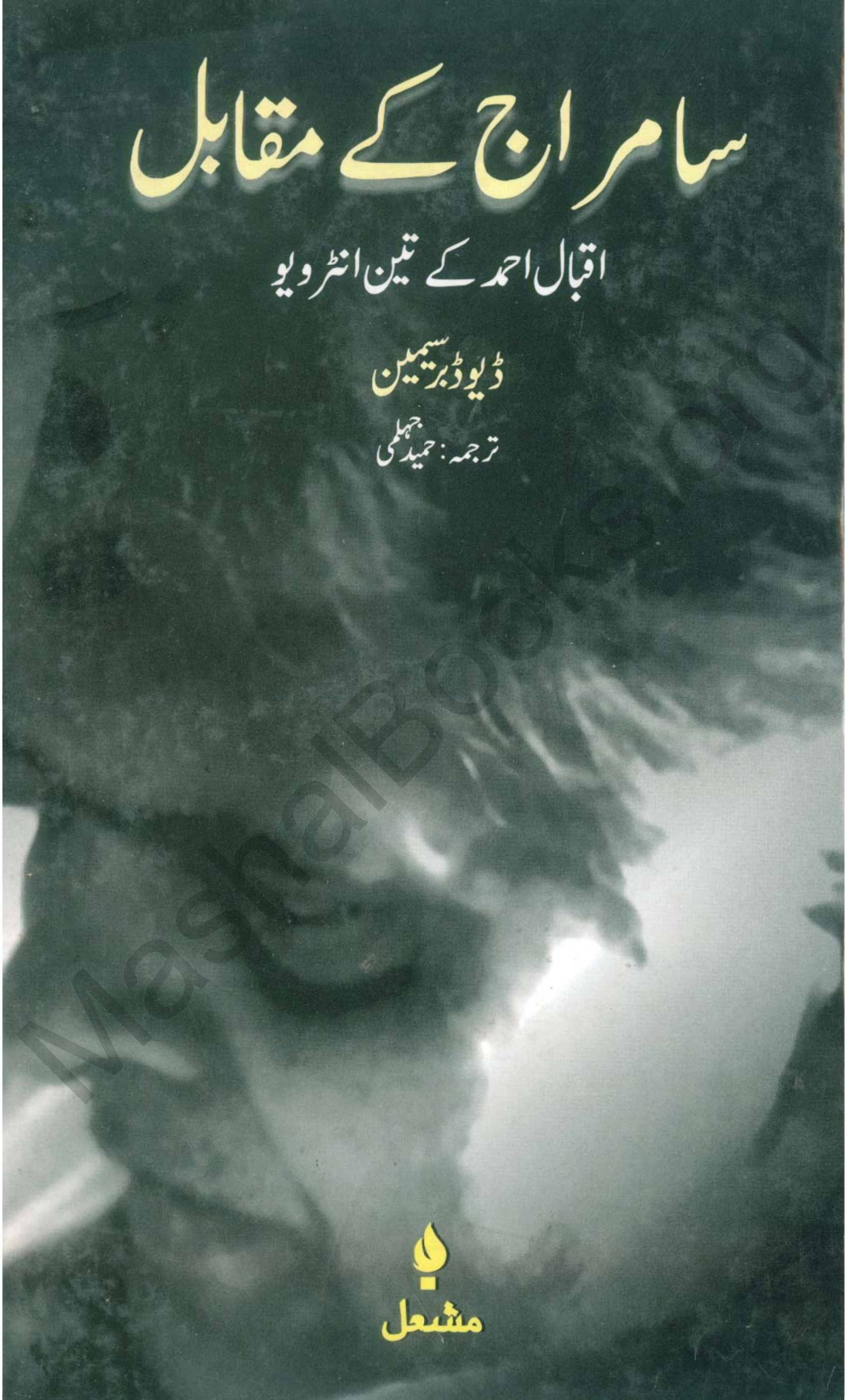

مشعل

MashalBooks.org

سامراج کے مقابل
اقبال احمد کے تین انٹرویو

ڈیوڈ برسیمین
ترجمہ: حمید جہلمی

مشعل
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،
لاہور۔54600، پاکستان

MashalBooks.org

سامراج کے مقابل

ڈاکٹر اقبال احمد کے تین انٹرویوز

ڈیوڈ برسیمین

ترجمہ: حمید جہلمی

کاپی رائٹ اردو(C) 2001 مشعل

انگریزی میں یہ کتاب Confronting Empire کے نام سے 2000 میں پلوٹو پریس لندن نے شائع کی ہے۔ پیش لفظ کے جملہ حقوق ایڈورڈ سعید کے نام ہیں۔ کتاب کا اردو ترجمہ پلوٹو پریس لمیٹڈ لندن کی اجازت سے شائع کیا جا رہا ہے۔

ناشر: مشعل
آر۔بی۔۵، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان
فون وفیکس 042-35866859

E-mail: mashbks@brain.net.pk

MashalBooks.org

ترتیب

اظہارتشکر 4
صبح آزادی ______ فیض احمد فیض 5
جنوبی ایشیا کا نقشہ 7
سوانحی خاکہ 8
مقدمہ ______ ڈیوڈ برسیمین 11
پیش لفظ ______ ایڈورڈ سعید 14
باب اوّل ______ ناقدانہ سوچ رکھو اور خطرے مول لو۔ 30
گاندھی اور تقسیم، کشمیر کے لئے جدوجہد، اعلیٰ تعلیم، فرانز فینن، میلکم ایکس، نوم چومسکی، ایڈورڈ سعید، فلسطین کا مسئلہ، فیض احمد فیض، مستشرقیت، طالبان، چودھراہٹ کی تشکیل نو، امریکی لیفٹ کا مستقبل۔
باب دوئم ______ مسخ شدہ تاریخ 100
نیشلزم کے خطرے، بعض خبریں جو شائع ہونے کے قابل ہیں۔ قبائل کو پرچم پکڑا دیئے گئے۔ جنوبی ایشیا میں ایٹمی سیاست، نیشنلزم اور اسلام، سرد جنگ کے بعد یک طرفہ اقدامات، دہشت گردی کی اصطلاح، ایران سے رسم و راہ، ترکی اور اسرائیل، آرمینی باشندوں کی نسل کشی، وی ایس نائی پال، گارڈز کی تبدیلی، اپنے اصول کی طرف واپسی، مارکس کا ورثہ، علمی وفکری کام۔
باب سوئم ______ پناہ گاہ قبول نہ کرو 157
جبر واستبداد کی شناخت، شاعری اور انقلاب، اقتدار کی بیماری، سری لنکا، بلقان میں نسلی اختلاف، بین الاقوامی یک جہتی، فرد پرستی کا کاروبار، گراچی اور کامو، محفوظ پناہ گاہ قبول نہ کرو۔
اقبال احمد کے منتخب مضامین کی فہرست۔

MashalBooks.org

اظہارِ تشکر

میں ممنون اور سپاس گزار ہوں دیپاچے کے لئے ایڈورڈ ڈبلیو سعید کا، فیض احمد فیض کی نظم ''صبح آزادی'' کے انگریزی ترجمے کے لئے شاہد علی کا۔ اس نظم کی خطاطی کے لئے فاروق علی کا۔ اس کتاب میں شامل تصویروں کے لئے جیولی ڈائمنڈ، اربن حام داور بیکا کینڈل کا۔ نقشوں کے لئے زولٹن کراس مین آف وسکوئسن کارٹوگرافرز گلڈ کا اور متعدد حوالوں کی فراہمی کے لئے زینب استرآبادی، زبیدہ مصطفیٰ اور عمران قریشی کا۔ دیگر معاونت اور مشوروں کیلئے ہمپشائر اور دوسری جگھوں پر اقبال احمد کے طلباء دوستوں اور رفقاء کا۔ سینڈی ایڈلر نقول کی تیاری میں مہارت نامہ رکھتی ہیں۔ساؤتھ اینڈ پریس میں سونیا شاہ اور انھوتی آرنوف نے متدوین میں ہاتھ ہٹایا، میں اُن کا بھی شکر گزار ہوں۔

اس کتاب کے چند اقتباسات نومبر1998ء میں رسالہ پروگریسو، میڈی سن، وسکونسن میں اور مارچ1999ء میں ہمل کھٹمنڈو نیپال میں شائع ہوئے۔

اس کتاب سے جو آمدنی ہوگی اس کا ایک حصہ ہمپشائر میں اقبال احمد کی یاد میں ہونے والے لیکچروں کے لئے وقف رہے گا، قارئین مزید معلومات کے لئے اقبال احمد انڈاومنٹ، پریزنٹ آفس ہمپشائر کالج ایمبرسٹ mao1002-یو ایس اے فون نمبر 413-559-5521 سے رجوع کریں۔

ای میل پتہ dfernandez@hampshire.edu

کتاب کے پہلے باب کے لئے انٹرویو 15,14 دسمبر1996ء کو ہمپشائر کالج میں، باب دوئم کے لئے انٹرویو اسی جگہ 24 اگست1998ء کو باب سوئم کے لئے 13,12 اکتوبر1998ء کو بولڈر کولوریڈو میں انٹرویو لیا گیا۔

MashalBooks.org

صبح آزادی

(اگست 1947ء)

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غم دل

جواں لہو کی پُراسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں بدن بلاتے رہے

بہت عزیز تھی لیکن رخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا دبی دبی تھی تھکن

MashalBooks.org

سنا ہے ہوبھی چکا ہے فراق ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہل درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذاب ہجر حرام

جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگار صبا کدھر کو گئی

ابھی چراغ سرہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانئ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدۂ ودل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

فیض

MashalBooks.org

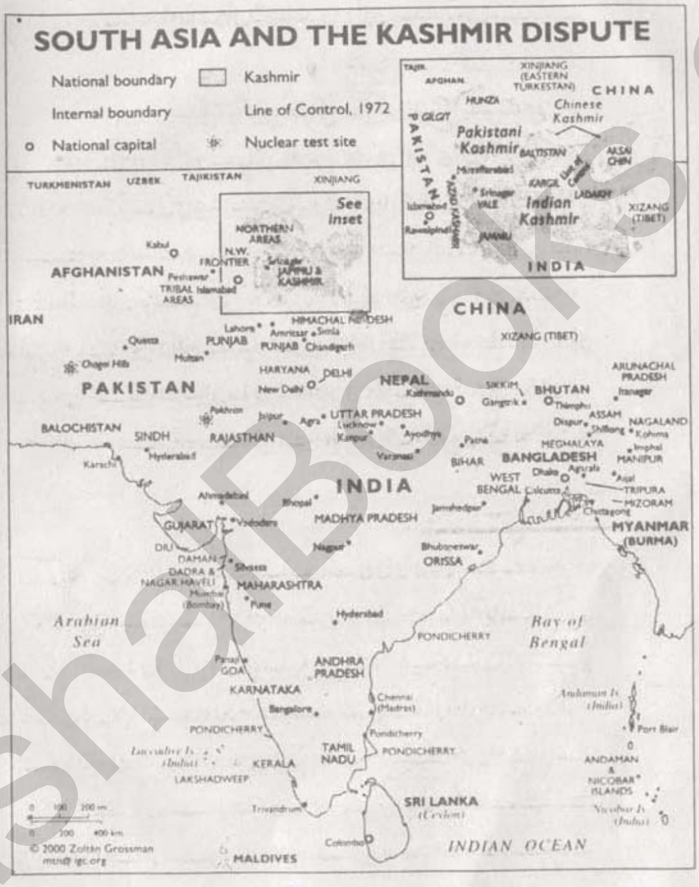

MashalBooks.org

اقبال احمد

اقبال احمد1933ء یا1934ء میں ہندوستان کے صوبہ بہار کے گاؤں ارکی میں پیدا ہوئے، چند برس بعد ان کے والد زمین کے تنازعے میں قتل ہوگئے، جب یہ واردات ہوئی تو نوعمر اقبال اپنے والد کے پہلو میں لیٹے ہوئے تھے۔1947ء میں ہندوستان کی تقسیم کے دوران، وہ اور ان کے بڑے بھائی ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے۔(1)

اقبال احمد نے1951ء میں لاہور کے فورمین کرسچین کالج سے گریجویشن کی اور اقتصادت میں ڈگری لی۔ کچھ عرصہ فوجی افسر کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔1957ء میں امریکی تاریخ کے روٹری فیلو کے طور پر انہیں کیلیئے فورنیا کے آکسیڈنٹل کالج میں داخلہ ملا۔1958ء سے1960ء تک انہوں نے پرنسٹن یونیورسٹی میں مشرق وسطیٰ کی تاریخ اور پولیٹیکل سائنس کی تعلیم حاصل کی، بعدازاں انہیں اسی مضمون میں پی ایچ ڈی کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

1960ء سے1963ء تک وہ شمالی افریقہ میں رہے۔ان کا زیادہ وقت الجزائر میں گزرا، جہاں وہ نیشنل لبریشن فرنٹ میں شامل رہے۔ وہاں وہ فرانز فینن کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے۔ ایویان میں جوامن مذاکرات ہوئے، اقبال احمد ان میں شرکت کرنے والے الجزائری وفد کے رکن تھے۔

امریکہ واپس آئے تو 1964ء سے 1965ء تک الی نوائے یونیورسٹی (شکاگو) 1965ء۔1968ء میں کارینل یونیورسٹی کے سکول آف لیبر ریلیشنز میں پڑھاتے رہے۔ان برسوں میں انہیں ویت نام اور کمبوڈیا سے متعلق امریکی پالیسیوں کے سب سے پہلے اور شدید ترین مخالف کے طور پر شہرت حاصل ہوئی۔(2)1969ء میں معلّمہ اور ادیبہ جیولی ڈائمنڈ سے انہوں نے شادی کی۔1968ء سے1972ء تک شکاگو کے ایڈلی سٹیونسن انسٹی ٹیوٹ کے فیلو رہے۔

1971ء میں ہنری کسنجر کو اغوا کرنے کی سازش میں شریک ہونے کے الزام میں، کیتھولک

امن پسند پادریوں ڈینیل اور فلپ بیریگن اور دیگر چار کیتھولک پادریوں کے ساتھ ان پر فردِ جرم عائد کی گئی۔ لیکن 59 گھنٹے کی سماعت کے بعد جیوری نے اس مقدمے ہی کو غلط قرار دے دیا۔

1972ء سے 1982ء تک اقبال احمد، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز کے سینیئر فیلو رہے۔

1973 سے 1975ء تک انہوں نے اس انسٹی ٹیوٹ کے سمندر پار ملحقہ ادارے، ''ٹرانس نیشنل انسٹی ٹیوٹ'' ایمسٹرڈیم کے پہلے ڈائریکٹر کے طور پر نمایاں خدمات انجام دیں۔

1982ء میں انہوں نے ایمہرسٹ میساچوسٹس کے ہمپشائر کالج کی فیکلٹی میں شمولیت اختیار کی، جہاں وہ عالمی سیاسیات اور پولیٹیکل سائنس پڑھاتے رہے۔

1990ء کے عشرے کے اوائل میں وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی حکومت نے انہیں ایک آزاد اور متبادل یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے ایک قطعہ زمین دیا۔ یہ یونیورسٹی خلدونیہ کے نام سے موسوم ہوتی تھی، لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی، کیوں کہ بے نظیر بھٹو کے شوہر آصف زرداری نے اس زمین پر قبضہ کرلیا وہ یہاں گالف کورس اور ایک کلب تعمیر کرنا چاہتے تھے۔(۳)

اقبال احمد ایک زود نویس مضمون نگار اور فعال شخصیت تھے، دنیا بھر کے انقلابی رہنما، صحافی، سرگرم عمل لیڈر اور پالیسی ساز افراد ان سے اکثر مشورہ کرتے اور رہنمائی حاصل کیا کرتے۔ وہ رسالے Race and Class کے مدیر، مڈل ایسٹ رپورٹ اور (Tiers Monde, L Economiste du) کے کنٹری بیوٹنگ ایڈیٹر رہے، وہ پاکستان فورم کے بانیوں میں سے ہے اور عرب سٹیڈیز کوارٹرلی کے عملہ ادارت کے رکن تھے، اقبال احمد ایک یگانہ روزگار دانشور تھے، جنہیں کوئی طاقت اور ہیئت حاکمہ کبھی مرعوب نہ کرسکی، وہ نوم چومسکی ہاورڈ زن، ابراہیم ابولغود رچرڈ فاک فریڈ جیمسن، الیگزینڈر کاک برن اور ڈینیل بیریگن ایسی متنوع شخصیتوں کے رفیق کار تھے۔(4)

1997ء میں ہمپشائر سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ مستقل طور پر پاکستان میں رہنے لگے تھے۔ یہاں وہ پاکستان کے سب سے موثر اور قدیم انگریزی روزنامے ڈان میں ہفتہ وار کالم لکھنے لگے، 11 مئی 1999ء کو حرکتِ قلب بند ہوجانے کے باعث اسلام آباد میں ان کا انتقال ہوا۔ انہیں بڑی آنت کا کینسر ہوگیا تھا، جس کی صرف ایک ہفتہ قبل تشخیص ہوئی اور آپریشن کیا گیا، اسی دوران دل کا دورہ پڑا، جو جان لیوا ثابت ہوا۔

MashalBooks.org

حوالے

1۔ایدورڈسعید: He Brought Wisdom and Integrity to the Cause of Oppressed People.

اخبارگارڈین14 مئی1999ءصفحہ22۔

2۔مائیکل ٹی کافمین Eqbal Ahmad: Scholar and Antiwar Activist. Dies at 67" May 13,1999

3۔عابداسلم "Memories of a Hopeful Prankster: Celebrating the life of Eqbal Ahmad" Towards Freedom 48:(4 1999 August, 23)

4۔ایڈورڈ He brought wisdom......

ڈیوڈ برسیمین

مقدمہ

اقبال احمد کے بارے میں ماضی کے صیغے میں سوچنا مشکل ہے میں جب ان کے لفظوں پر نظر دوڑاتا ہوں تو ان کی شہد کی سی میٹھی آواز اور خوش الحان لہجہ، میرے کانوں میں رس گھولنے لگتا ہے۔ اقبال احمد اردو شاعری کے بڑے رسیا تھے وہ اپنی بات سمجھانے اور بات کی تہہ تک پہنچنے کے لئے برمحل شعر پڑھتے، وہ نفی سے اثبات تک پہنچنے کے عادی تھے، میں ان کے بارے میں خوشی اور غم کے ملے جلے احساسات کے ساتھ لکھ رہا ہوں، خوشی اس بات کی کہ ہمیں ان کی یہ کتاب میسر ہے اور غم اس بات کا کہ اقبال اب ہم میں نہیں رہے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب پہلے پہل میں نے ان سے کتاب کے لئے سلسلہ وار انٹرویو کرنے کی بات کی تو ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور انہوں نے والہانہ انداز میں اتفاق کا اظہار کیا انہوں نے میرے خیال کو پسند کیا۔ میں نے ایڈورڈ سعید کے ساتھ "The Pen and the Sword" کے عنوان سے جو کتاب لکھی تھی اس کا دیباچہ اقبال احمد نے ہی لکھا تھا (1) نوم چومسکی اور ہاورڈ زِن کے ساتھ میں نے جو کام کیا تھا، وہ اس سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ ہماری ملاقات عجب صورت میں ہوئی تھی، وہ عمر کے اعتبار سے مجھ سے بڑے تھے لیکن ہم دونوں ایک ہی ''کنارے'' پر تھے میں نے ہمیشہ اُن سے ایک تعلق خاطر محسوس کیا، میں نے کچھ وقت جنوبی ایشیا میں گزارا تھا اور ان کی زبان ''اردو'' بولی تھی اور ہند کی اسلامی ثقافت میں ان کی دلچسپی کو سمجھا تھا۔ (2) میں اپنے ماں باپ کی طرح بے گھر نہیں ہوا تھا لیکن وہ جس اکھاڑ پچھاڑ اور ابتلا سے گزرے اس کا مجھ پر گہرا اثر تھا۔

MashalBooks.org

اقبال سے ملنے سے بہت پہلے میں ان سے اور ان کی فعالیت اور کارکردگی سے آشنا ہو چکا تھا۔1983ء میں نیویارک میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی ۔ یہ یادگار اور بے حد فکرانگیز اور خیال افروز تھی۔ ہم ان کے باورچی خانے میں بیٹھے تیسری دنیا، امپریلزم اور دوسروں پر انحصار کے بارے میں باتیں کرتے رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں نے ان کا بہت ہی اہم انٹرویو لے لیا ہے۔ میں نے اس وقت اسے سننے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔لیکن گھر پہنچا اور ٹیپ ریکارڈ چلایا تو پتہ چلا کہ ٹیپ پر تو کچھ بھی نہیں تھا وہ خالی تھا۔ میں بٹن دبانا اور اسے چلانا بھول گیا تھا۔جس طرح جنوبی ایشیا میں کہتے ہیں۔''بابا اب کیا کریں؟''۔گھبراہٹ اور شرمندگی کے احساس کے ساتھ میں نے اقبال کو فون کیا اور انہیں اپنی حماقت کے بارے میں بتایا۔انہوں نے کہا کہ'' کوئی بات نہیں آ جایئے ہم دوبارہ باتیں کرلیں گے'' ایک دوروز بعد ہم نے دوبارہ انٹرویو کرلیا۔ کشادہ دلی اور مرّوت ان کا خاصہ تھا۔ برسوں بعد جب بھی میں نے یہ قصہ ان کے دوستوں کو سنایا تو سب کا کہنا تھا کہ''اقبال واقعی ایسے انسان ہیں''

انٹرویو کا وقت بڑی تیزی سے اور کسی تکلیف کے بغیر پورا ہو گیا حالانکہ اس میں چھ گھنٹے لگے۔انہیں گفتگو کرنے کا سلیقہ آتا تھا وہ بات سے بات نکالتے، جو سننے والے کو اُکساتی اور باتیں کرنے پر اُبھارتی۔ ہماری گفتگو کے دوران کھانے پینے کا دور بھی چلتا رہا، اگست1998ء میں ہم نے اسی قسم کی ایک طویل گفتگو کے درمیان وقفہ کیا اور ماؤنٹ ہولی اوک کے گرد ایک چکر لگایا۔ اس وقت وہ متفکر اور سنجیدہ سے تھے۔انہوں نے بتایا کہ ان کی صحت اچھی نہیں۔دس مہینے بعد وہ انتقال کر گئے۔

یہ کتاب جن انٹرویوز پر مشتمل ہے ان کے موضوعات آج بھی وقت سے ویسے ہی ہم آہنگ ہیں جیسے ان کے ساتھ باتیں کرتے وقت تھے۔ دوسرے لفظوں میں تروتازہ ہیں، اقتصادی زوال اور پاکستان میں ہوش ربا انداز حکمرانی (اکتوبر1999ء میں جب جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف کو معزول کیا ہے اس کے بعد سے پاکستان ایک بار پھر فوجی کنٹرول میں ہے) ہندو بنیاد پرستی، جنوبی ایشیا میں ایٹمی ہتھیار، کشمیر، افغانستان، بلقانی ریاستیں، سری لنکا، فرقہ پرستی، اقتدار کے قضیے تیسری دنیا کے ملکوں کا انتشار اور امریکی امپریلزم کے تہ بہ تہ مسائل، بہت سوں نے ان موضوعات پر بات کرنا چھوڑ دی تھی۔لیکن اقبال احمد نے ان کا ذکر کرنا کبھی نہیں چھوڑا۔ان کے عزیز دوست پرویز ہود بھائی نے اقبال احمد کا لیکچر پہلی بار سننے کے بعد کہا کہ''اقبال احمد نے جس

MashalBooks.org

علم ودانش ، زورِ بیان اور جوش وجذبے کے تباہ کن امتزاج کے ساتھ اور بی خطا نشانے لگا کر امریکہ کی سامراجی مہم جوئی کے گرد بنے ہوئے جھوٹے اور مفروضوں کے بخئے ادھیڑے ہیں اس سے پہلے کبھی دیکھنے سننے میں نہیں آیا۔''

ان دنوں عوامی دانشوروں کی تحسین وستائش کی ایک روچل پڑی ہے، لیکن اقبال احمد، علم و دانش اور عملی جدوجہد کا نادر نمونہ تھے۔ انہوں نے سماجی تبدیل لانے کی داعی، ترقی پسند تحریکوں کو صرف اپنے علم وفکر کی کمک ہی نہیں پہنچائی بلکہ بذات خود ان تحریکوں میں عملی حصہ بھی لیا۔ وہ عوام اور عدل وانصاف کے لئے فکر مند رہتے تھے۔

دوسرے انٹرویو کا اختتام علامہ اقبال کے ایک شعر پر ہوا ہے جس میں ان جذبات اور احساسات کا اظہار کیا گیا ہے جن کی بازگشت اس کتاب کے ہر صفحے میں سنائی دے گی۔ اقبال احمد ان لوگوں میں سے تھے جو حقائق کے اندر جھانکنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

بولڈر کولوریڈو
مئی 2000ء

حوالے

1۔ اقبال احمد۔ ایڈورڈ سعید کی کتاب The Pen and the Sword
2۔ دیکھئے ہارڈزن کی کتاب The Future of History
3۔ اور چومسکی کی کتاب The Common Good

جرأتِ گفتار و کردار کو سلام

ایڈورڈ سعید

ہمارے عزیز دوست اور رفیق اقبال احمد کی گھنٹوں تعریف وتوصیف کی جاتی ہے۔ وہ اس کے مستحق بھی ہیں۔ اس کے باوجود ان کے بارے میں مزید بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ میں جی ہی جی میں خوش ہوتا ہوں اور اپنی پیٹھ تھپکتا ہوں کہ میں اقبال کے بارے میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں یا کم از کم اس کی کوشش کر سکتا ہوں۔ ان کے بارے میں سب سے قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس امر کے باوجود کہ دوسروں کے مقابلے میں انہوں نے بہت سی سرحدیں عبور کیں اور نئی نئی حدود پامال کیں، ہر نئی صورتِ حال، ہر نئی جگہ اور ہر سیاق وسباق میں ان کی نہایت پُر اعتماد شخصیت اسی طرح قائم رہی۔ یہ قطعاً کوئی نسلی یا مذہبی شناخت کا معاملہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کا کسی رواجی استقلال سے تعلق ہے جو بالعمو ثابت قدم شہریوں سے منسوب کیا جاتا ہے، بلکہ اقبال احمد کی فکر ودانش کی تابنا کی اور بے ساختگی، بے عیب تجزیہ، مستقل مزاجی اور گرم جوشی نے رڈیارڈ کپلنگ کے کردار ''کم'' کے بقول انہیں پوری دنیا کا ہمدم اور دمساز بنا دیا ہے۔ (1)

شکاگو، بیروت، نیویارک، تیونس ایمہرسٹ غرض جہاں بھی اُن سے ملاقات ہوئی، میں نے حیرت سے دیکھا کہ وہ نہایت آسانی کے ساتھ اپنے آپ کو ایک نئی اور ایسی شخصیت میں ڈھال لیتے ہیں جو نئی صورت حال سے نبرد آزما ہے۔ تاہم ان کی بنیادی خصوصیت میں سرِ مُو تبدیلی یا فرق محسوس نہیں ہوتا۔ انہی اوصاف نے انہیں ہمیشہ کے لئے ہمارا سچا دوست اور رفیق کار بنا دیا۔ اقبال احمد طلباء نوجوانوں، دوستوں، ضرورت مندوں اور جدوجہد میں ہم سفروں کے لئے وقت دینے کو تیار ہمیشہ رہتے۔ وقت، علم اور چیزوں کے عطا کرنے میں ان جیسا فیاض کوئی نہیں دیکھا۔

MashalBooks.org

برسوں کی شناسائی میں انہوں نے کبھی ایک بار بھی یہ عذر پیش نہیں کیا کہ وہ کسی اہم کام میں مصروف ہیں اس لئے وقت نہیں نکال سکتے۔ میں نے ان سے بے شمار مرتبہ، مختلف معاملات کے بارے میں پوچھا۔ ہر بار بات سننے، معاملات سلجھانے، کسی مشکل صورتحال سے نکالنے، سیاسی خطرے یا ذاتی الجھنوں سے نمٹنے غرضیکہ ہر ضمن میں مدد دینے اور رہنمائی کرنے کے لیے انہیں تیار پایا۔

وہ دوستوں کا حوصلہ بڑھاتے، ان میں خود اعتمادی پیدا کرتے اور ان کا خیال رکھتے ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ 1987ء میں نہایت بااثر یہودی شخصیات کے ایک گروپ نے جو اسرائیل سے تعلق رکھتا تھا مجھ سے نجی طور پر صلاح مشورہ کرنا چاہا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ فلسطینیوں کے عزائم اور خاص طور پر اسرائیلی اقدامات کے خلاف فلسطینیوں کی مزاحمت کے بارے میں الجھن کا شکار ہیں۔ قابلِ ذکر پہلو یہ تھا کہ ہماری ملاقات فلسطینیوں کی انتفاضہ تحریک شروع ہونے سے چند ماہ پہلے ہونی طے پائی تھی۔ میں پہلے ہی اسرائیل اور امریکی یہودی لیڈروں سے غیر اعلانیہ اور کبھی کبھی خفیہ ملاقاتوں میں مصروف تھا یہ ملاقاتیں بے نتیجہ اور بے مصرف رہی تھیں۔ اس لئے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آگے کیا کیا جائے۔ آزاد فلسطینی لیڈر تنظیمی طاقت اور عالمی حمایت سے محروم تھے جبکہ یہودیوں کے بڑے بڑے لیڈر تھے اور ان کی درجنوں تنظیمیں تھیں اور ان کا اسرائیل سے خصوصی تعلق بھی تھا۔ غرض فلسطینیوں اور یہودیوں کے درمیان بڑا فرق تھا۔

میں اس وقت تک اقبال احمد کو سیاسی امور و معاملات میں اپنا گرو تسلیم کر چکا تھا۔ چنانچہ پہلا کام میں نے یہ کیا کہ ان سے پوچھا کہ مجھے یہودی رہنماؤں سے ملنا چاہیے یا نہیں؟ ان کا جواب اثبات میں تھا۔ میں نے کہا کہ پھر وہ میرے ساتھ چلیں۔ چنانچہ دوسرے معاملوں کی طرح، اس پر بھی وہ میرا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ حالانکہ نہ وہ فلسطینی تھے اور نہ ان لوگوں میں سے تھے جو پہلی ملاقاتوں میں شریک رہے ہوں۔ اس کے باوجود اقبال احمد ہی وہ واحد شخصیت تھے، جن پر میں پورا اعتبار کر سکتا تھا، جو سچی بات کہنے والا تھا، جو میری رہنمائی کرنے والا تھا اور جو ہمارے لئے ایک اور قابل اعتماد بولنے والا تھا۔ غرض ملاقات ہوئی، جس کے دوران اقبال نے ہر نوع کے اشتعال انگیز سوالوں کا بڑے تحمل کے ساتھ مسکت جواب دیا اور ایسی کئی گتھیاں سلجھائیں جن میں، میں پھنستا جا رہا تھا۔ تین گھنٹوں کے مذکرات کے دوران ایک مقام پر ایک یہودی لیڈر نے کہا کہ اگرچہ اس نے اپنی کئی تقریروں میں یاسر عرفات کو ایک دہشت گرد اور ہٹلر کہا ہے لیکن وہ جانتا ہے کہ وہ سچ نہیں بول رہا۔ اس پر اقبال نے نہایت آہستگی لیکن برجستگی سے کہا کہ آپ بے وجہ

MashalBooks.org

ریاکاری کررہے ہیں۔ یہ بات اقبال ہی کہہ سکتے تھے میں نہیں۔

یہاں ایک اور واقعہ کا ذکر بھی ضروری ہے۔1970ء کے پہلے عشرے کے دوران میں نے اقبال احمد کو بیروت آنے کی دعوت دی، جہاں وہ یاسر عرفات اور دوسرے فلسطینی لیڈروں سے ملے جنھوں نے اقبال کے ماہرانہ اور مخلصانہ تجزیے کا فوراً اعتراف کرلیا۔1980ء کے موسم گرما میں لبنان کی خانہ جنگی کے دوران، اقبال نے یاسر عرفات کے ساتھی، لبنان اور دوسرے علاقوں میں پی ایل او کے فوجی کمانڈر ابوجہاد کو قائل کرلیا کہ انہیں جنوبی لبنان میں پی ایل او کے فوجی ٹھکانوں کا دوراہ کرنے دیا جائے۔ اقبال نے دورہ کیا اور چند روز بعد ایک مفصل رپورٹ فلسطینی لیڈروں کی پیش کردی۔ رپورٹ میں اقبال نے دوسال بعد ہونے والے اسرائیلی حملے کی صحیح پیش گوئی کردی تھی۔1982ء میں یہ حملہ ہوا اور اس کا وہی نتیجہ نکلا جس کی اقبال نے نشان دہی کی تھی۔

صرف فوجی معاملات میں ہی ان کی مہارت متاثر کن نہیں تھی، بلکہ فلسطینی لیڈروں نے محسوس کرلیا تھا کہ اقبال فلسطینیوں کے حقیقی دوست ہیں اور ان کی جدوجہد میں برابر کے شریک ہیں ان کا اخلاص اور مقصد کے ساتھ ان کی لگن سچی ہے، حالانکہ وہ فلسطینی نہیں ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ اپنے ایشیائی ہونے اور سفید چمڑی کے نہ ہونے کا انہوں نے فائدہ اُٹھایا۔ میں یہ بات طنزاً نہیں بلکہ تعریف میں کہہ رہا ہوں۔ فلسطینی جانتے تھے کہ ان کا معاملہ اپنے ایک مسلمان بھائی سے ہے۔ اقبال احمد کو جدوجہد کے حوالے سے جاننے والے اس حقیقت سے آشنا تھے کہ اقبال کی وفاداری اور استقامت شک وشبہ سے بالا ہے۔ وہ سراپا دردمند اور اور عبقری ہیں۔ جب وہ کسی سے ''ہم'' کہہ کر مخاطب ہوتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ ایک فرد کے طور پر نہیں بلکہ اپنے سب ہم خیال احباب کی طرف سے بول رہے ہیں اور ان کی ترجمانی کررہے ہیں لیکن انہوں نے اپنی دیانت اور ناقدانہ حسیات کی قیمت پر کبھی ایسا نہیں کیا۔ انہیں ہمیشہ مقدم رکھا۔ اسی سبب سے اقبال سچے معنوں میں آزاد منش رہے۔ کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ وہ دوسروں کے مسائل سے لاتعلق رہے یا انہیں اپنے مسائل درپیش نہیں تھے۔ اس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ لیکن وہ یہ تاثر ضرور دیتے ہیں جیسے وہ اپنے لئے ہی سوچتے اور عمل کرتے ہیں اور اگر دعوت دی جائے تو وہ دوسروں کے کام کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ ان کی جڑیں بہار اور لاہور میں ہیں۔ انہوں نے برطانوی راج کے دور کے دکھ درد جھیلے ہیں، نوآبادیات کے خاتمے پر جو المیے رونما ہوئے اُن کا بھی سامنا کیا ہے، فرقہ وارانہ نفرت، تشدد، علیحدگی پسندی اور تقسیم اسی ذیل میں آتی ہیں۔

MashalBooks.org

ماضی کی تلخی کو جس میں سفید فام مبتلا تھے اور جوان کے بعد ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے مزاج کا حصہ بنی، اقبال احمد نے چنداں اہمیت نہیں دی اور نہ ہی اس کی بنا پر کسی ردِعمل کا اظہار کیا۔ وہ انتقام کی بجائے تخلیقی عمل میں دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ انقلابیت کی بجائے روح وعمل کی طباعی کے حق میں ہیں اور اپنے ہم سفر سیاسی سائنس دانوں کی نپی تلی باتوں پر ایثار پیشگی اور گہرے تجزیے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے ایک بے حد جاندار مضمون، جو ریجس دیبرے کے بارے میں ہے کا عنوان ہے ''انقلابی لیکن غلط'' (2)

میں نے اپنی کتاب "Culture and Imperialism" ان کے نام منسوب کی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی ذات میں (امریکی) سلطنت کی سیاسیات ہی نہیں، بلکہ اقتصادی قاعدوں اور فلسفیانہ تقلیلی فارمولوں کے بجائے انسانی زندگی میں اظہار پانے والے تجربوں کے سارے تانے بانے ایک مجسم شکل اختیار کر گئے ہیں۔ (3) اقبال احمد نے ''سلطنت'' کے تجربے سے جو سمجھا وہ یہ تھا کہ یہ سلطنت یا سامراج نہ صرف اپنی تمام صورتوں میں ہر چیز پر حاوی ہے بلکہ اس کی مزاحمت میں جو خلاقی، طباعی اور نظری گہرائی پیدا ہوتی ہے وہ بھی اس کے زیر اثر ہے۔ ''خلاقی'' ''طباعی'' اور ''بصیرت'' ایسے الفاظ ہیں جو سیاست اور تاریخ کے بارے میں ان کے رویوں میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

ویت نام کے بارے میں اقبال احمد کی ابتدائی تحریریں دراصل انقلابی جنگ یا طریق حرب سے متعلق ان کے مقالوں کا وہ سلسلہ ہے جو انہوں نے اس موضوع پر امریکی نظریوں کی نفی کرنے کی غرض سے لکھے تھے۔ امریکی ماہروں کے نزدیک ویت نامیوں کی مزاحمت، درحقیقت ایک سازش کے تحت کمیونسٹ اور دہشت پسندانہ بغاوت تھی، جسے برتر ہتھیاروں، واضح اور حقیقت پسندانہ نظریوں اور بھاری تعداد میں فوج کو میدان میں لانے سے فرو کیا جا سکتا تھا۔ اس کے برعکس اقبال احمد کا کہنا تھا کہ انقلابی گوریلے عدل وانصاف کے لئے لڑ رہے ہیں، انہیں عوام کی حمایت حاصل ہے اور وہ اپنے مقصد اور نظریے کی خاطر قربانی دینے کا عزم رکھتے ہیں۔ انہوں نے ویت نامی عوام کو منظّم کیا ہے۔ بغاوت فرد کرنے کا نظریہ پیش کرنے والے جو بات بھولتے ہیں یا ماننے کے لئے تیار نہیں یہ ہے کہ مقامی اشرافیہ کے مفادات اپنے ملک سے نہیں بلکہ امریکہ سے وابستہ ہیں۔ وہ انقلابی جنگ لڑنے والوں کو مات نہیں دے سکتے۔ اقبال نے اپنے نظریات کے کٹر دشمن اور انقلابیوں کے مقابلے کے لئے طاقت پر انحصار کرنے کے حامی سیموئیل ہنٹ ٹنگٹن کے جواب میں لکھا۔

''پسماندہ ملکوں میں حصولِ آزادی کے بعد سکون واطمینان کی جگہ مایوسیاں اور نئے مطالبات پیدا ہونے لگے ہیں جنہیں پورا کرنا کسی ایسی سیاست کے بس کی بات نہیں جو سرحدوں کی تنظیم اور خاص افراد کے تعاون پر انحصار رکھتی ہو، امریکہ ہمارے حکمرانوں کی طرح اس حقیقت کو سمجھ نہیں پارہا یا سمجھنا نہیں چاہتا کہ سماجی تبدیلی سے متعلق ہماری ضرورت اور استحکام پر امریکہ کا اصرار، تبدیلی کے لئے ہماری بے صبری اور نظم وضبط کے لئے امریکہ کے حد سے بڑھے ہوئے تقاضے، انقلاب کی جانب ہماری پیش رفت اور امریکہ کا تیسری دنیا کے ڈاکو امراء کے ذریعہ اصلاحات کو ممکن قرار دینا، قومی آزادی اور خودمختاری کی ہماری خواہش اور امریکہ کی بے دام اتحادیوں کے لئے ترجیح، قومی سرزمین کو بیرونی قبضے سے آزاد دیکھنے کی ہماری چاہت اور امریکہ کی فوجی اڈوں کی ضرورت کے درمیان نمایاں فرق ہے۔ ہمارے دکھ درد اور امریکہ کی طمانیت کے درمیان فرق بڑھتا جائے گا۔ کچھ یہی تضاد ہمارے تناظر اور ہماری ترجیحات کے درمیان بھی بڑھے گا۔ جب تک امریکہ مفادات اور مقاصد کا نئے سرے سے تعین نہیں کرتا امریکہ سے ہماری محاذ آرائی بڑھتی رہے گی۔ امریکہ کے زیر بار ایشیائی اور امریکی ریاستوں کی حالت اور بھی زیادہ اندوہناک ہوجائے گی۔ اس پورے پس منظر میں ویت نام شاید کچھ زیادہ الگ تھلگ یا عجیب نہیں ہے۔ آنے والے حالات کے لئے یہ انتباہ بھی ہوسکتا ہے۔(4)

ان تحریروں سے جو بات سامنے آتی ہے وہ روایتی اور غیر روایتی خیال اور اس سے بھی زیادہ انصاف اور ناانصافی کے درمیان تصادم ہے۔ اقبال احمد کی ترجیح ہمیشہ یہ رہی کہ آزادی، جاندار ثقافت اور عوامی فلاح سے ہی غیر روایتی اور انصاف پر مبنی نظام قائم ہوسکتا ہے۔ یہ ان کا پختہ عقیدہ تھا اور اس پر انہوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ مستعد افواج، جامد اور بے جان بیوروکریسی اور مختلف خانوں میں بٹی ہوئی حکومتوں پر انہیں کوئی اعتماد نہیں ہے، لیکن جیسا کہ انہوں نے ڈیبرے پر اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ اگر غیر روایتی ہونے کا یہ مطلب ہے کہ روایات کا احترام نہ کیا جائے۔ عورتیں اور مرد جن اشیاء سے خوش ہوتے ہیں انہیں ناپسند کیا جائے اور انسانی زندگی میں زیادہ استحکام پیدا کرنے سے گریز کیا جائے، تو یہ کافی نہیں ہے۔ اقبال احمد بڑے ہوشیار اور حقیقت پسند

انسان ہیں انہیں احساس ہے کہ انقلاب کے مقصد سے معاشروں میں اتھل پتھل پیدا کرنا اور یہ نظر انداز کر دینا کہ انسان باہم محبت بھی کرتے ہیں خوشی بھی مناتے اور تقریبات میں حصہ بھی لیتے ہیں، ایک بے رحمانہ فعل ہے، یہ ایک تخریبی فعل ہے، جو انقلابی تو ہوسکتا ہے لیکن صریحاً غلط ہے۔

اقبال نے ڈیبرے کو پہاڑوں میں گوریلا بن کر رہنے کے حوالے سے رومانوی خوشی منانے کا حق ضرور دیا ہے لیکن سیاسی مفکر برک کے انداز میں ایسے عناصر کی اصلاح بھی کی ہے جنہوں نے انسانوں کی سیاسی اور سماجی زندگی کے حقائق کا طویل اور بدقت نظر مطالعہ نہیں کیا اور لکھا ہے کہ ذاتی خوبیاں اور اجتماعی تجربات، آسانی سے قومی اور عوامی اداروں میں نہیں ڈھلتے۔(5)

افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ ڈیبرے کی کم نگاہی امریکہ کے بغاوت مخالفت نظریے کے بھی کام آتی ہے جو والٹ ڈ ہٹمین راس ٹو وغیرہ کی شخصیت میں مجسم ہوگئی ہے۔ سچے انقلاب میں عوامی تحریک اپنے آغاز کے بعد جمہوری اداروں کی تشکیل کا وسیلہ بنتی ہے۔ لیکن ڈیبرے کا نظریہ، حقیقی دنیا پر، جہاں مرد اور عورتیں رہتی ہیں مثبت اثرات مرتب کرنے کی بجائے، عارضی نتائج کا محرک ثابت ہوتا ہے۔ اقبال نے ڈیبرے پر کڑی تنقید کی ہے تاہم انہوں نے اس کے کام میں اپنے اندر ''وقت سے آزاد اپیل'' کا ہونا بھی دریافت کیا ہے۔ اسے اقبال کی فیاضی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ وہ بدترین مخالفوں اور مفروضوں پر انحصار رکھنے والوں کو بھی کسی حد تک برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔(6)

اقبال احمد کی بیشتر تحریریں، نہ صرف ان تجربات کی مظہر ہیں، جو انہیں پاکستان اور ہندوستان میں حاصل ہوئے بلکہ الجزائر کے تجربات بھی ان کی تحریروں کی بنیاد بنے ہیں۔ تاریخیں یاد نہ رکھنے اور اپنی فتوحات کے ذکر میں وقت ضائع کرنے سے گریز کی جوان کی عادت ہے اس کے سبب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ (الجزائری) دوران کے تمام کاموں میں مرکزی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ وہ سب سے زیادہ اہمیت اور وقعت انسانی عنصر کو دیتے ہیں کہ دشمن سے مجادلہ کے بجائے اس کی صفوں کو منتشر کر دیا جائے۔ دوسرے وہ نوآبادیاتی یا غیر منصفانہ حاکمیت کو خلاف قانون قرار دینے کی ضرورت کو اہم جانتے ہیں اور اس کے متبادل مساوی بنیادوں پر ایسی تنظیموں کے قیام کو ضروری قرار دیتے ہیں جو استحصالی طاقت سے عوام کو نجات دلانے کا وسیلہ ہوں۔ آخر میں اور شاید سب سے اہم بات یہ کہ وہ جنگی ڈھانچوں کو جمہوری اور قومی اداروں میں بدل ڈالنے کی تلقین کرتے ہیں۔ الجزائر کے بارے مین اقبال احمد کے مضمون میں پہلے دو عوامل کو کامیاب اور

موثر قرار دیا گیا ہے اور تیسرے کو ناکام بتایا گیا ہے۔(7)

چنانچہ انہوں نے لکھا کہ الجزائر کے پہلے صدر بن بیلا نے بلا شرک غیرے بھرپور طاقت ہاتھ میں لے لی۔ ان کے بعد حوری بومدین نے یہی انداز اپنایا جس کی وجہ سے نیشنل لبریشن فرنٹ (قومی محاذ آزادی) کمزوری اور لاچارگی کا شکار ہوگیا۔ نتیجے میں خونخوار بیوروکریسی نے آج کے الجزائر کو خون میں نہلا دیا ہے۔ اس کے باوجود اقبال نے انقلابی فتح اور کامیابی کی قدر و قیمت کا احساس کیا اور انہوں نے حقیقی آزادی کے امکان کے بارے میں نا اُمیدی کا اظہار نہیں کیا۔ اس ضمن میں ان کے رفیق فرانز فینن کا ان پر اثر نمایاں نظر آتا ہے۔ فینن نے کہا تھا کہ ہم نے سفید فام پولیس مین کو اس لئے نکال باہر نہیں کیا کہ کالے یا بھورے پولیس میں ان کی جگہ لے لیں۔ قومی شعور میں سے نیا معاشرتی شعور پیدا ہونا چاہیے۔ یہ ایسی آزمائش ہے جس میں نوآبادیاتی چنگل سے نکلنے والے اکثر ممالک ناکام رہے ہیں۔

اقبال احمد نے 1980ء اور 1981ء میں عرب سٹیڈیز کوارٹرلی کے لئے تیسری دنیا میں اقتدار کی ہوس کے بارے میں جس زوردار انداز میں تین مختصر مضامین لکھے کسی اور کو ایسے ہی شدید احساس اور گہرائی سے لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔(9)

دوسرے درجے کے مفکروں اور بعداز مارکسزم مارکسی مفکروں کے علی الرغم، جو علمی اور روشن خیال جرائد پر چھائے ہوئے ہیں، اقبال احمد انقلابی نظریات اور ان کے پورا ہونے اور صحیح ثابت ہونے کے وعدے پر کامل یقین رکھتے ہے۔ انہوں نے برسوں تک عرب دنیا، پاکستان اور الجزائر میں عسکریت کے بارے میں جو پرجوش لیکچر دیئے اُنہیں سننے والے انسانی حیات کے تقدس اور وقار سے متعلق ان کے اعلیٰ اخلاقی موقف سے اچھی طرح آگاہ ہیں، انسانی زندگی کا وہ تقدس اور وقار جسے آمروں اور ان کے ہم نوا نام نہاد دانشوروں نے بری طرح مسخ اور پامال کیا۔ اقبال احمد اپنے عظیم دوست اور اردو کے عظیم شاعر فیض احمد فیض کے تخلیقی جوہر، ژرف نگاہی اور علم و عرفان کے بے حد معترف ہیں۔ وہ انہی اوصاف کو سیاسی زندگی کے لئے معیار تسلیم کرتے ہیں۔ کروفر اور اعزاز کی تمام دوسری شکلیں، لمبی موٹر کاریں اور طاقت کے نشے سے معمور بیوروکریسی کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ وہ ہر وصف اور خوبی کو انسان کے حوالے سے ناپتے اور دیکھتے ہیں، مجرد قانون اور اخلاق سے بے نیاز طاقت کے حوالے سے نہیں۔

میرا خیال ہے کہ ان کے لئے ایسے مقاصد اور اصولوں پر کاربند رہنا خاصہ مشکل ہوتا ہوگا۔

اقبال احمد کا بیشتر تحریری کام اور یقیناً ان کی عملی جدوجہد تاریک ایام میں ظہور پذیر ہوئی۔ انہوں نے صرف کرۂ ارض پر سامراج کی لائی ہوئی تباہ کاریوں اور ناانصافیوں کا ہی بھرپور جائزہ نہیں لیا بلکہ اس کے ساتھ ہی خصوصیت کے ساتھ اسلامی ملکوں اور اسلامی کلچر کی خامیوں اور افسوسناک صورت حال کی روداد بھی بھرپور انداز میں بیان کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ وہ محض مذہبی اور ثقافتی جنون کا ہی ماتم نہیں کرتے جیسے مغرب نے غلط انداز میں سمجھا ہے، بلکہ تنگ نظر مذہبی تحریک کے پھیلنے پر افسوس کرتے ہیں۔ اقبال عرب نہیں تھے تاہم انہوں نے عربوں کو یاد دلایا کہ عرب قوم پرستی محدود بنیاد کا نیشنلزم نہیں ہے، بلکہ نیشنلزم کی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت ہے، کیونکہ اس نے سرحدوں سے باہر نکل کر ہمہ گیر ربط و تعلق قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے لفظ و احساس کے ذریعہ عالم گیر برادری تشکیل دینے کا تصور پیش کیا ہے۔ ہر شخص جو اپنے محسوسات، زبان اور ثقافت کے اعتبار سے عرب ہے ''وہ عرب ہے'' اس طرح ایک یہودی عرب ہے ایک عیسائی عرب ہے ایک مسلم عرب ہے ایک کرد عرب ہے۔ میں کسی ایسی قومی تحریک سے واقف نہیں جس نے اس وضاحت کے ساتھ اپنا تعین کیا ہو۔

ایسی صورتحال میں اور ایسے ورثے کے تعلق سے اقبال احمد نے ان خیالات اور اقدار کی گراوٹ کو محسوس کیا جو عربوں اور مسلمانوں کو یکساں طور پر اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ آیئے ہم پھر ان کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ 1993ء میں خلیجی جنگ کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے انہوں نے لکھا:

> ''ہم بدمعاشی کے دور میں رہ رہے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ کا یہ تاریک دور ہے ہتھیار ڈالنے، ملی بھگت کرنے کا دور، جس کے بیچ میں پاگل پن بھی سوار ہوتا رہا۔ ہماری تہذیب کا زوال اٹھارہویں صدی میں شروع ہوا جب ہم نے دانش کے نام پر دقیانوسیت کو گلے لگایا۔ ہم روشن خیالی اور سائنسی انقلاب کے دور کو پھلانگ گئے۔ بیسویں صدی کی دوسرے نصف میں گراوٹ کا یہ عمل مکمل ہو گیا۔''
>
> میں زندگی میں ہتھیار ڈالنے کے کئی مواقع کا شاہد رہا ہوں۔ لڑکپن میں 1948ء میں، نوجوانی میں 1967ء میں اور ادھیڑ عمری میں 1982ء میں یہ پستی کی انتہا تھی۔ میں سوچتا رہا کہ آئندہ اگر ایسی صورتحال پیش آئی تو ہم عزت و وقار کا تھوڑا بہت شائبہ تو برقرار رکھیں گے۔ لیکن جب صدام حسین نے خلیجی جنگ کو جنگوں کی ماں قرار دیا تو خوش قسمتی

سے مجھے اس میں خوش اُمیدی کی برائے نام جھلک بھی دکھائی نہیں دی۔(10)

ایک طرف یہ اور دوسری طرف ہمہ جہت انحطاط تھا جسے انہوں نے فسطائیت اور علیحدگی پسندی سے تعبیر کیا۔ پاکستان میں دونوں کو با آسانی پہنچانا جاسکتا ہے یہ دونوں رجحانات علامتی طور پر باہم منسلک ہیں۔ پاکستان کے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے خاندان اور جنرل محمد ضیاء الحق اور ان کے حاشیہ نشینوں نے خوب لوٹ مار کی جس نے عوام کے حوصلوں کو پست کیا۔ انہوں نے ملک کی بغاوت پر آمادہ ثقافتوں کو رام کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ اس کوشش میں بہت خون بہا اور بہت سرمایہ غارت ہو۔ وہ اسلامی دنیا کی طرح دوسری جگہوں پر بھی اسلامی ازم کو تو فروغ نہ دلا سکے البتہ ایک اشتعال کی صورت ضرور پیدا کی جس کی اقبال احمد نے ہمیشہ مخالفت کی۔ وہ خود سیکولر ہیں ہمیشہ جہد آزما اور فعال و متحرک۔ انہوں نے کبھی ہار نہیں مانی وہ مسلسل لکھتے رہے۔

1994ء میں انہوں نے عظیم عرب مورخ اور سوشیالوجی کے بانی ابن خلدون کے نام پر پاکستان میں خلدونیہ یونیورسٹی قائم کرنے کے منصوبے کے لئے کام شروع کیا۔ اس کے لئے وہ نہایت پرجوش تھے۔ وہ ڈان کیہوتے نہیں تھے کہ ہوا کی چکیوں سے لڑتے وہ مارکسٹ مفکر انتونیو گرامچی کے بقول ''دانش کی یاسیت اور عزم کی رجائیت'' کے قائل تھے۔ (11)

یہ اُن کے منفرد ہونے کی دلیل تھی۔ وہ جانتے تھے کہ خوش اُمیدی میں رہنے اور اپنے آپ کو ڈرامائی اہمیت دینے کی بجائے کسی روایت میں محفوظ بہترین شے کو کس طرح محفوظ کیا جاسکتا ہے اُن کے نزدیک اسلام، عرب ازم اور امریکی آئیڈیلزم ایسے خزانے ہیں جن سے بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اُس کے لئے ضیاء الحق اور ہنری کسنجر ہونے کی ضرورت نہیں ہے جن کی کارستانیاں اور ریاکار حکمت عملی ہر اس چیز کی تباہی کا باعث بنی جسے انہوں نے ہاتھ لگایا۔

اقبال نے جو کچھ کیا اور جو کچھ لکھا اس سب سے بڑھ کر جس چیز نے مجھے متاثر کیا اور اقبال کے بارے میں جس نے زیادہ گہرائی سے سمجھنے میں میری مدد کی وہ ان کا شجاعانہ دفاعی انداز اور فلسطینیوں سے غیر متزلزل تعلق خاطر اور یکجہتی ہے۔ بے شمار مہاجر، کیمپوں میں رہنے والوں اور زمین کے بدنصیب لٹے پٹے درماندہ لوگوں کے لئے جنہیں ان کے اپنے لیڈروں، عربوں اور مسلمانوں نے بھلا دیا تھا اقبال احمد چراغِ راہ ہیں۔ انہوں نے جس طرح ان کا حوصلہ بڑھایا کوئی فلسطینی اُسے کبھی بھلا نہیں سکتا۔ میں نے اقبال کو فلسطینی نوجوانوں، لیڈروں، ماہروں، دانش

وروں، بچوں اور بوڑھوں کے ساتھ گھل مل کر رہتے ان کا دکھ بانٹتے اور ان کی ہمت بندھاتے دیکھا۔ میں ان لوگوں کی آنکھوں میں اقبال کی جرأت، تابانی اور سچی انسانیت نوازی کی جھلک دیکھ سکتا ہوں۔ اقبال احمد نے فلسطین کے لئے جو جدوجہد کی اس کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اس سے کسی قسم کا مادی یا فکری مفاد ہرگز وصول نہیں کیا۔ اس کے لئے کوئی فلسطینی ان کا احسان نہیں چکا سکتا۔ دیکھا جائے تو فلسطینی کاز ہی ناشکری سے مملو ہے۔ اس کے لئے سچے دل سے کام کرنے والوں کو نفرت، حقارت اور دھتکارے جانے کے سوا کبھی کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اقبال احمد نے یہ ساری رسوائیاں برداشت کی ہیں۔ ہمارے ساتھ جرأت مندانہ اور غیر مصالحانہ رفاقت کا انہیں بھاری نقصان اُٹھانا پڑا۔ یہی نہیں کہ ان کے دن اور مہینے ضائع ہوئے، نہ صرف مایوسیوں، فلسطینیوں کی زندگی کے مسخ ہونے کی اذیت، ہتھیار ڈالنے اور ہزیمت اٹھانے کی ذلت اور عقل وآگہی اور منصوبہ بندی کے باب میں ناکامیوں کا مُنہ دیکھنا پڑا بلکہ اقبال کو اپنے پیشے اور لکھنے کے ضمن میں ایسا نقصان اٹھانا پڑا جس کا انہوں نے کبھی بھولے سے بھی ذکر نہیں کیا۔ فلسطین کا کاز بہت مشکل ہے اس لئے نہیں کہ یہ غیر منصفانہ ہے بلکہ اس لئے کہ منصفانہ ہے۔ ساتھ ہی اس کے حق میں کچھ کہنا بے حد پُرخطر بھی ہے۔ اقبال نے جس صحت اور دیانت کے ساتھ فلسطین کے کاز کی ترجمانی کی وہ صرف انہی کا حوصلہ اور کام تھا۔

کتنے ہی دوست اس مسئلے سے پہلو بچائے رکھتے ہیں، کتنے ہی دوست فلسطین کے قضیے میں اُلجھنے سے دامن کش رہتے ہیں۔ کتنے ہی روشن خیال ہیں جو بوسنیا، چیچنیا، صومالیہ، روانڈا، جنوبی افریقہ، نکاراگوا اور ویت نام اور کرہ ارض پر ہر کہیں انسانی اور شہری حقوق کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور کہہ لیتے ہیں لیکن فلسطین اور فلسطینیوں کے بارے میں مہر بلب رہتے ہیں۔ لیکن اقبال نہیں۔ وہ اپنی بے باکی اور کھلے بندوں اظہار رائے کرنے کی بے لاگ جرأت کی بنا پر اپنے مصلحت کوش دوستوں کے لئے ندامت کا سامان کرتے رہتے ہیں۔ وہ فلسطین کے مسئلے پر بولتے، لکھتے اور اس کی اہمیت نمایاں کرتے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا رویہ ایسے بچے کا ہے جو بڑوں کے ڈرانے دھمکانے کے باوجود نہیں مانتا اور گھر کی راز کی باتیں، جنہیں بڑے چھپا کر رکھنا چاہتے ہیں ظاہر کر دیتا ہے۔ اقبال نے جو کچھ کہا اور لکھا اس مرحلے میں اور ہمارے بہت سے ساتھی ان کے شکر گزار ہیں۔ اقبال نے ہمارے لئے جو کچھ کیا اور کہا اُسے کبھی نہیں بھلا سکیں گے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ نہ کبھی مدح وستائش کے طالب ہوئے اور نہ بے جا جوش وجذبے کے اظہار پر آمادہ رہے، وہ

MashalBooks.org

نہایت متین اور سنجیدہ انسان ہیں ہماری (فلسطینیوں کی) خود ارادیت کے لئے جدوجہد کے حامی بھی اور ناقد بھی، انہوں نے کبھی منفی انداز نقد ونظر نہیں اپنایا ہمیشہ مثبت رویہ اختیار کئے رکھا، وہ حقیقت پسندی کے ساتھ دوررس تجاویز پیش کرتے رہے۔ افسوس کہ ان میں سے کسی پر عمل نہیں کیا گیا۔

اقبال کا اسرائیلی یہودیوں کے بارے میں جو رویہ رہا اس کی نرمی ونزاکت اور حسیت نے مجھے ہمیشہ متاثر بھی کیا اور حیران بھی۔1987ء میں انہوں نے یہودی لیڈروں سے ملاقات میں انہیں بتایا کہ فلسطینی جس مسئلے سے دوچار ہیں وہ دوقومیتوں کے مصائب کا مسئلہ ہے۔ تمام لوگوں کے مصائب کے بارے میں ان کا شعور اتنا پختہ اور بےلوث ہے کہ وہ سازشوں کے مفروضوں اور یہودی دشمنی کا کبھی شکار نہیں ہوئے۔ اس کے برعکس وہ اسرائیلی یہودیوں کے بارے میں بڑے شریفانہ انداز سے بات کرتے ہیں اور ان غیر اسرائیلی یہودیوں کے ضمن میں خصوصی توجہ دیتے ہیں، جن پر ان کے ناقد نشتر زنی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

1970ء کے عشرے میں انہوں نے ایک بڑی شاندار تجویز پیش کی جو ان کے غیر متشددانہ پیش رفت کے رویے سے ہم آہنگ تھی، یہ کہ پی ایل او، اردن، لبنان اور شام میں اسرائیلی سرحدوں کی طرف فلسطینیوں کا مارچ منظم کرے۔1950ء میں (امریکہ میں) شہری حقوق کے لئے مارچ کرنے والوں سے متاثر ہوکر اقبال احمد نے یاسر عرفات اور ان کے رفقاء پر زور دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہتھیار لئے بغیر سرحدوں کی طرف پیش قدمی کرنے پر آمادہ کریں۔ انہوں نے صرف جھنڈے اٹھائے ہوں جن پر لکھا ہو کہ ''ہم اپنے گھروں کو جانا چاہتے ہیں۔'' مجھے یاد ہے کہ جب میں نے فلسطینی رہنماؤں کو اقبال کی تجویز کی اہمیت سمجھائی تو ان کے چہروں پر بےیقینی اور خوف وہراس کے سائے لہرانے لگے۔ اور خاص طور پر جب میں نے زور دیا کہ یہ منظم پیش قدمی مکمل طور پر پُرامن ہونی چاہیے۔ اس زمانے میں اقبال گولی اور بندوق کے استعمال کے سخت خلاف تھے۔ وہ ''مسلح جدوجہد'' کے نعروں اور فلسطینیوں کی فکر اور تنظیم میں عسکریت کے نفوذ سے خوش نہیں تھے۔

بیروت میں اقبال کے لئے ایک مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا۔ اقبال احمد نے یہ حکمت عملی اختیار کرنے کی تجویز دی کہ امریکہ میں فلسطینیوں کے لئے انسانی حقوق کی تحریک منظم کی جائے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمیں امریکی کانگریس کے حلقوں، اہم سول اداروں مثلاً گرجا گھروں، کالجوں،

MashalBooks.org

لیبر یونینوں کے طریق کار کے بارے میں تفصیلی معلومات جمع کرنا چاہیں۔ اس کے لئے اول درجے کے ہوائی ٹکٹوں پر اور بیوروکریسی اور وسکی کی بوتلوں پر جو سرمایہ ضائع ہوتا ہے اس کا صرف دسواں حصہ درکار ہوگا۔ دس برس بعد انہوں نے تیونس میں جلاوطن فلسطینی لیڈر شپ کے سامنے یہی تجاویز پھر رکھیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کا بھی نتیجہ وہی نکلا جو پہلے نکلا تھا۔ بعد میں عرفات نے مجھ سے کہا کہ تم اور اقبال مسلسل کہتے ہو کہ ہم امریکہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں نے پی ایل او کی اعلیٰ ترین سطح پر امریکہ کے لئے ایک کمیٹی قائم کی ہے جو تحقیق کرے گی۔ ہمیں مشورے اور آراء دے گی اور عمل کے تمام ممکنہ امکانات کے بارے میں بتائے گی، مجھے اُمید ہے کہ تم دیکھو گے کہ اس طرح تم دونوں کامیاب ہوگے۔

ایک برس بعد مجھے معلوم ہوا کہ مجوزہ کمیٹی بنا تو دی گئی تھی لیکن ایسے ہی تھی جیسے ''گلیور ٹریولز'' سے نکلی ہو۔ اس کے ارکان میں سے کوئی بھی انگریزی نہیں جانتا تھا۔ ان کا کبھی اجلاس نہیں ہوا۔ انہوں نے ایک کل وقتی ریسرچر خاتون مقرر کر دی۔ یہ ایک بڑی ذہین خاتون تھیں انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کی ''ریسرچ'' صرف یہ تھی کہ انہوں نے کمیٹی کے ارکان سے کہہ سن کر ٹائم رسالے کا اپنے نام اجراء کرا لیا اور کبھی کبھی انٹرنیشنل ہیرلڈ ٹریبیون خریدنے کی اجازت لے لی۔ ایک چوکس اور مستعد لیڈر شپ کے لئے وہ اتنا کچھ ہی کر سکیں۔

میرا خیال ہے کہ اقبال احمد اور میں دونوں ہی اس وقت جانتے تھے کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے جس کا زمینی سطح کی عوامی تحریک سے کوئی علاقہ نہیں تھا، حالانکہ ہم اس کا ذکر نہیں کرتے تھے ہونے والا یہ تھا کہ امریکیوں سے یہ سودا ہو جائے کہ عرفات اور اُن کے ہم نواؤں کو اقتدار میں رہنے دیا جائے۔ یعنی اسرائیلی قبضہ برقرار رہے اور یہ اسرائیل کے شریک کار رہیں۔ اقبال ان معدودے چند مآل اندیش افراد میں سے تھے جنہوں نے اوسلو میں ہونے والے معاہدوں کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ انہیں کمزوروں کا امن کہتے دوسری طرف عرفات مسلسل کہتے رہے کہ یہ ''بہادروں کا امن'' ہے جیسے وہ بیس بال ٹیم کے بارے میں کہہ رہے ہوں۔(12)

اقبال ہمیشہ تاریکی کی مذمت پر ہی قانع نہیں رہے۔ 1996ء میں انہوں نے بیت المقدس شہر کے پرانے علاقے کی سرنگ میں حادثے کے موقع پر مجھ سے عرفات کے آئندہ اقدامات کے بارے میں کھری کھری باتیں کیں کہ اس پوزیشن میں وہ کیا کر سکتے ہیں۔ چند روز بعد میں نے عربی اخبارات میں اپنے مستقل کالم میں اقبال کی تجویز کے متعلق لکھا۔(13)

MashalBooks.org

اس وقت تک اقبال اور میں مقامی اخبارات میں کالم لکھنے لگے تھے ہم دونوں نے محسوس کیا کہ ہمیں نیویارک ٹائمز میں چھپنے کا خیال چھوڑ کر اپنے لوگوں سے مقامی پریس کے ذریعے مخاطب ہونا چاہیے۔

اقبال احمد کی تجویز تھی کہ یہودیوں کی آبادکاری کے خلاف گلی کوچوں میں بے ثمر اور بے نتیجہ لڑائیاں لڑنے کی تحریک کے قانونی اور جائز ہونے کی بحث میں پڑنے اور وقت ضائع کرنے کی بجائے کہ اس میں مردوں اور عورتوں کی جانوں کی ضیاع کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔(اور ایسا ہوا بھی) عرفات کو ایک یہودی بستی کی طرف ایک غیر مسلح ہجوم لے کر چلنا چاہیے جس نے بینر اٹھائے ہوں جن پر لکھا ہو کہ ''ہم غیر مسلح ہیں ہم آپ سے لڑنا نہیں چاہتے البتہ آپ جو اینٹیں اور پتھر پھینکیں گے ان کا مقابلہ کریں گے۔'' اس کی بجائے عرفات ایک جگہ ہی بیٹھے رہے۔ انہوں نے عام ہڑتال کرنے کا نعرہ دیا جس سے اصل نقصان فلسطینیوں کا ہوا جن کی دکانیں بند رہیں اور اپنے کاروبار میں خسارہ اٹھانا پڑا۔

اقبال احمد نے موجودہ صورتحال کا نہایت قطعیت اور صحت کے ساتھ جائزہ پیش کیا ہے جو ان کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ اسرائیلی حکومت یہودی آبادی کو اسرائیل کے شہروں اور بندرگاہوں سے ملانے کے لئے سڑکیں، بڑی شاہراہیں اور مواصلات کے سلسلے قائم کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ وہ فلسطینی آبادیوں کو اس انتظام سے باہر رکھ رہی ہے۔ یہ خودمختار علاقے ہمارے پاس ہیں جن کا انتظام تو فلسطینی اتھارٹی کے پاس ہے لیکن اس اتھارٹی کو کوئی اختیار نہیں ہے، اس کا زمین پر قبضہ نہیں ہے، یہ پانی کی حفاظت نہیں کر سکتی، اسرائیل کی اجازت کے بغیر صنعتیں قائم نہیں کر سکتی یہ قبائلی طرز کے علاقے ہیں جنہیں چاہیں تو خودمختار فلسطینی اتھارٹی کا نام دے لیا جائے۔ اسرائیل یہ چالاکی کر رہا ہے کہ اپنا قبضہ برقرار رکھنے کے باوجود مقبوضہ آبادی کے بارے میں اپنی ذمہ داری سے دستبردار ہو رہا ہے۔

یہ ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ ایک نسلی ریاست کا یوٹوپیا جو ایک نہایت روشن خیال اور تاریخی طور پر مسلمہ انسانیت نواز لوگوں کے ہاتھوں اور سیکولر مقامی لیڈرشپ کی رضامندی سے تعمیر کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ رجحان برقرار رہا تو آنے والی دہائی میں اسرائیل اور فلسطین، گزرے ہوئے دور کی یاد تازہ کریں گے۔ ایک اور نسل پرست جنوبی افریقہ بن جائے گا۔

ایک فعال کارکن، دانشور، سکالر، استاد اور دوست کی حیثیت سے اقبال کے کام کا پھیلاؤ

نہایت وسیع ہے۔ انہوں نے بے کنار سمندروں اور سرحدوں کا بڑی مہارت اور قابل رشک اپنائیت کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔ وہ کبھی پیشہ وروں کی ادق اور پیچیدہ مصطلاحات اور ہنرمندی سے مرعوب نہیں ہوئے۔ انہوں نے اپنی زبان کو بڑی درستگی سے استعمال کیا۔ اسے نازک تجزیے کا وسیلہ بنایا اور دنیا بھر کے لوگوں کے تجربے کو نہایت زندہ دلی اور جامعیت سے بیان کیا۔ انہوں نے خلیجی بحران کے حوالے سے "Beyond the storm" (طوفان کے ماوراء) کے پیش لفظ میں جس کا عنوان ہے Portent of a New Century تعمیم کا جس شاندار طریقے سے استعمال کیا ہے جس طنزیہ انداز سے تلخ حقائق بیان کئے ہیں اور اس تحریر میں جو دبا ہوا غصہ ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ اور یہ بھی دیکھئے کہ ہر جملے میں تلخ حقائق بیان کرنے سے وہ کبھی نہیں ہچکچاتے اور ان کے ہر جملے میں جو بصیرت ہے وہ سیموئیل ہنٹ ٹنگٹن اور زبگینو برزنسکی جیسے خود پسند مصنفین کی کتابوں کا موضوع بن سکتی ہے۔

انہوں نے لکھا:۔

''بیسویں صدی ایک ایسی شاندار صدی ہے جس نے بیک وقت اُمید بھی دلائی ہے اور نا اُمیدیاں بھی پیدا کی ہیں۔ جیسے جیسے اس کا اختتام قریب آ رہا ہے لگتا ہے کہ اس کا اختتام بھی اس طرح ہوگا جس طرح اس کا آغاز ہوا تھا۔ وہ سیاست دان اور جنگجو سردار، جن کے دل ودماغ پر ماضی کی گہری چھاپ ہے نئی اُمیدیں بیدار کر رہے ہیں اور منصفانہ اور پرامن عالمی نظام کی باتیں کر رہے ہیں۔

بیسویں صدی کے شروع ہونے سے پہلے تین سو برس تک دنیا جدید سائنس، ٹیکنالوجی، اور امپریلزم کے ذریعے اپنی ہیئت بدلتی رہی تھی۔ سرمایہ داری اور یورپی توسیع کے اس دور میں عالمی نظام پر مغرب کو غلبہ حاصل ہوا۔ بین الاقوامی منڈی پر مغرب کی اجارہ داری قائم ہوئی اور بین الاقوامی منڈی مکمل طور پر مغرب کے لئے مختص ہوگئی۔ بظاہر یہ بڑا خوش کن محسوس ہوتا ہے جیسے آزاد منڈی واقعتاً آزاد تھی اور جو اہل، مستحق افراد اور قوموں کے کام آ رہی تھی لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ مغرب کی اجارہ داری طاقت کے بل پر قائم ہوئی، وہ اتنی وسیع، اتنی منظم تھی اور اسے مذہبی اور اخلاقی جواز بھی حاصل تھا کہ آج تک عالمگیر تشدد کا وہی علمی نظریہ مغرب اور غیر مغربی دنیا کے درمیان تعلقات کی صورت گری کا وسیلہ ہے۔ (14)

MashalBooks.org

آپ یہ سطور پڑھتے ہوئے محسوس کریں گے کہ اُمید و یقین کی آواز آپ سے مخاطب ہے، لیکچر کرتے ہوئے نہیں، بلکہ باتیں کرتے ہوئے۔ اقبال کی یہی خوبی ہے۔ اقبال، جو ایک ساتھی، طالب علم، تحقیق و جستجو کے رسیا، اصولوں پر کاربند اور انصاف کے جویا ہیں۔ جنہوں نے کبھی عقل و استدلال سے ہٹ کر نہ کچھ کہا اور نہ لکھا۔ مجھے برسوں افسوس رہا اور آپ کو بھی افسوس ہوگا کہ انہوں نے کوئی بڑی کتاب نہیں لکھی لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ اقبال احمد نے بہت کچھ لکھا ہے جو بکھرا ہوا ہے۔ دنیا بھر میں ان کے مضامین، عالمانہ تجزیے، صحافیانہ تحریریں اور انٹرویو پھیلے ہوئے ہیں۔

اقبال نے انٹرویو دینے سے کبھی گریز نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں بھی گئے لوگ انٹرویو لینے ان کے گرد جمع ہو گئے، اقبال کو ایک پیشہ ور عالم کا انداز اپنانے پر آمادہ کرنا سمندر میں ہل چلانے کے مترادف ہے۔ اس میں کسی کو کامیابی نہ ہوئی لیکن 1997ء میں جب وہ ہیمپشائر کالج سے ریٹائرڈ ہوئے تو انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ میں اپنا وقت کیسے گزاروں؟ اور اپنی تحریروں میں کن امور پر توجہ دوں؟ اس پر میں بہت خوش ہوا اور میرا حوصلہ بڑھا، لیکن میں اس وقت انہیں کوئی ایسا مفید مشورہ دینے کا اہل نہیں تھا، جو وہ چاہتے تھے۔ بعد میں سوچا تو تجویز کیا کہ وہ صرف وہی کرتے رہیں جو وہ اب تک اچھی طرح کرتے رہے ہیں۔ لیکن ہم سب کے لئے اور جو جوان ہیں ان کے لئے جہاں گشت جوگی کی طرح صرف باتیں ہی نہ کریں جنہیں یاد رکھنا آسان نہیں ہوگا، اپنے پیروکاروں اور چیلوں کے لئے ایسے لفظ ہی نہ چھوڑ جائیں جنہیں ہوائیں اڑاتی اور بکھیرتی پھیریں اور نہ ایسے الفاظ جو ٹیپ میں بند ہو کر رہ جائیں، بلکہ متعدد کتابوں کی جلدوں میں انہیں شائع کریں، جنہیں ہر کوئی پڑھ سکے۔ اس طرح وہ بھی جنہیں ان سے ملنے کا موقع نہیں ملا وہ بھی جان جائیں کہ وہ صحیح معنوں میں کیسے شاندار اور دانا انسان تھے۔ جس طرح ورڈز ورتھ نے ملٹن کے بارے میں کہا تھا کہ ''دنیا کو تیری ضرورت ہے۔''

حوالے

یہ دیباچہ میری اس تقریر پر مبنی ہے جو میں نے 4 اکتوبر 1997ء کو ہیمپشائر کالج ایمہرسٹ، میساچوسٹس میں اقبال احمد کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے کی تھی۔

1۔ رڈیارڈ کپلنگ KIM ایڈیٹر۔ ایڈورڈ سعید (نیویارک)
2۔ اقبال احمد Radical But Wrong منتھلی ریویو (جولائی، اگست 1968ء)
3۔ ایڈورڈ سعید Culture and Imperialism (الفرڈ نوف 1993ء)
4۔ اقبال احمد کا مکالمہ ہنٹ ٹنگٹن وغیرہ No more war (ہارپر 1968ء)
5۔ اقبال احمد Radical But Wrong
6۔ ایضاً
7۔ اقبال احمد Algeria's Un-ending Tragedy (ڈان 20 ستمبر 1997ء)
8۔ فرانز فینن The Wretched of the Earth
9۔ اقبال احمد From Potato Sack to Potato Mash
10۔ اقبال احمد The Hundred Hour War (ڈان 17 ستمبر 1991ء)
11۔ انٹونیو گرامچی Selection from the Prison Notebook
12۔ اقبال احمد After the Peace of the Weak
(ہفت روزہ الاہرام 5 نومبر 1998ء)
13۔ ایڈورڈ سعید The End of the Peace Process
14۔ اقبال احمد Beyond the Storm
15۔ ورڈز ورتھ جلد 3

MashalBooks.org

باب اول

ناقدانہ سوچ رکھو اور خطرے مول لو

گاندھی اور تقسیم

س: آپ کے بچپن کا ایک سنگین واقعہ آپ کے والد کا قتل تھا!

ج: اس واقعہ نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ کیونکہ اس وقت میں بچہ ہی تھا اس لئے اس واقعہ نے مجھ پر گہرا زخم چھوڑا تھا، اس کے علاوہ میں نے غیر شعوری طور پر زندگی کے بارے میں کچھ نتائج بھی اخذ کئے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ طبقہ، خونی رشتے سے کہیں زیادہ اہم ہے اور جائیداد لوگوں کو دوستی اور وفاداریوں سے زیادہ عزیز ہوتی ہے، کیونکہ میرے والد کے قتل میں بعض رشتہ دار ملوث تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ میرے والد کی سیاست کے سبب ان کی جائیداد کو خطرہ ہے میرے والد نیشنلزم سے دلچسپی رکھتے تھے انہوں نے زمین بطور عطیہ دے دی تھی جس سے ان لوگوں کے خیال میں بُری مثال قائم ہوتی تھی۔

س: آپ جب جنوبی ایشیا کے 52 سالہ عرصہ پر نظر دوڑاتے ہیں جس میں مہاتما گاندھی، ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک، اس کے بعد ہندوستان کی دو ملکوں میں تقسیم ہوئی پھر نتیجے میں خون خرابہ ہوا، تو کیا آپ کے خیال میں اس سب سے بچنے کی کوئی صورت ممکن تھی؟

ج: میں بھی یہی سوچتا ہوں جب دو فرقے حقیقتاً سات سو برس بقائے باہم کی بنیاد پر اکٹھے رہتے آئے ہوں ایسے میں علیحدگی سے بچ نکلنے کے طریقے یا راستے تلاش کرنا مشکل نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی لیڈر شپ جس میں گاندھی بھی شامل

MashalBooks.org

تھے، ہندوستان کے دونوں فرقوں کا تاریخی تسلسل برقرار رکھنے کا یقین دلانے میں کیوں ناکام رہی۔ ہندو اور مسلمان ایک ساتھ رہتے آئے تھے، ان کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوتی رہی، جیسا کہ ہر نوع کے تعلقات میں ایسا ہوتا آیا ہے لیکن دونوں فرقوں کے لوگ زیادہ تر باہم ایک دوسرے کا ساتھ دیتے آئے تھے اور اس عمل میں بہت سی مشترک صورتیں پیدا ہوگئی تھیں۔ ایک تہذیب نے جنم لے لیا تھا۔ اردو کی شکل میں ایک نئی زبان منظر عام پر آ گئی تھی مسلمان اپنے ساتھ جو کچھ لائے تھے اور انہیں برصغیر میں سے جو کچھ میسر آیا، زبان اس کے امتزاج کا نتیجہ تھی۔ باہمی ابلاغ اور بات چیت کا مشترک وسیلہ بن گئی تھی آرٹ کی نئی طرز اور نئی موسیقی رواج پا گئی تھی۔ شمالی ہندوستان کی موسیقی، پرانی جنوبی کرناٹک کی روایت سے یکسر مختلف ہے۔

تقسیم سے بچا سکتا تھا لیکن جیسا کہ عظیم شاعر اور ادیب رابندر ناتھ ٹیگور نے پیش بینی کی تھی کہ ''جب تک ہندوستان کی سامراج دشمن تحریکیں نیشنلزم کے نظریے کو ترک کرنے کی ضرورت محسوس نہ کر لیں تقسیم سے نہیں بچا جا سکتا'' ہم نے مغربی سامراج کو تو مسترد کر دیا لیکن مغربی نیشنلزم کو گلے لگا لیا۔

نیشنلزم، اختلاف کا نظریہ ہے اس لئے گاندھی ہندوستان کی تقسیم کے اتنے ہی ذمہ دار ہیں جتنا کوئی اور۔ پاکستان کے بانی محمد علی جناح بھی اس میں شریک ہیں۔ ٹیگور اور گاندھی کے درمیان جو مذاکرات ہوئے اب ان کی تفصیل ہمارے سامنے ہے۔ ٹیگور نے گاندھی کو تنبیہ کی تھی کہ دیکھیں آپ ہندوستان میں جس طرح کی سیاست کو رواج دے رہے ہیں وہ دونوں فرقوں کو تقسیم کرنے کا موجب ہوگی۔(1)

س: آپ کے خیال میں کیا گاندھی کے ہندو اصطلاحات کے استعمال، ہندوازم اور رام راجیہ کے تصور، اپنے اجتماعات میں بھجن اور بھگتی موسیقی کو رواج دینے کے سبب سے مسلمانوں میں بے چینی کا احساس پیدا ہوا؟

ج: ہاں، اس صورت میں کہ گاندھی کو ہندو فرقہ پرست تسلیم کیا جائے جیسا کہ پاکستانی نیشنلسٹ انہیں سمجھتے ہیں۔ میں کہوں گا کہ گاندھی ایک سامراج دشمن موقعہ شناس انسان تھے یہ موقعہ پرستی کا اثر تھا کہ انہوں نے ایسی سیاست اپنائی جس نے ہندوستان میں سیاست کو روحانی رنگ دیا اور فرقہ پرستی سے مملو کر دیا۔ میں اس ضمن میں دو مثالیں دینا

MashalBooks.org

چاہوں گا۔

گاندھی 1915ء میں جنوبی افریقہ سے واپس ہندوستان پہنچے اس وقت تک وہ اہنسا کا مسلک اختیار کر چکے تھے۔ اہنسا، عدم تشدد، ستیہ گرہ، خاموش مزاحمت، ان کے جنوبی افریقہ میں قیام کے دوران ان کے دل میں گھر کر چکے تھے چنانچہ جب وہ ہندوستان آئے تو انہوں نے قومی منظر پر شہاب ثاقب کی طرح چکاچوند پیدا کردی۔ ان کا عروج ڈرامائی تھا۔ 1916ء تک گاندھی قومی حیثیت حاصل کر چکے تھے۔

انہوں نے سب سے پہلا مسئلہ ترکی میں خلافت کے تحفظ کا اُٹھایا، یہ جدید ہندوستانی تاریخ کا بڑا ہی پیچیدہ اور آسیب زدہ مسئلہ تھا۔ مشرق وسطیٰ میں عثمانیوں کا زوال ہورہا تھا نوجوان ترکوں نے کمال اتاترک کی سربراہی میں ترک نیشنلزم کی تحریک شروع کردی تھی۔ ان کے نزدیک عثمانی سلطان اُن کا نمائندہ نہیں تھا وہ سلطان کو نکال باہر کررہے تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا خیال تھا کہ عثمانی سلطنت کا خاتمہ برطانوی حیلہ گری کا نتیجہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے خلافت بچانے کے نام پر برطانیہ مخالف تحریک شروع کی۔ مہاتما گاندھی اس میں شامل ہوگئے یہ بہت بڑی تحریک تھی جس میں مسلمان پوری طرح منظم اور شریک تھے۔ گاندھی بھی علی برادران یعنی محمد علی جوہر اور شوکت علی کے ساتھ ہوگئے۔ کانگرس پارٹی نے تحریک خلافت کی حمایت شروع کردی۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی جنہیں بعد میں انڈین نیشنل کانگرس میں اہم حیثیت حاصل ہوئی تحریک خلافت کا ساتھ دینے لگے۔ محمد علی جناح نے گاندھی کو انتباہ کیا، ''یہ نہ کرو یہ سیاست میں مذہب کا استعمال ہے، مذہب یا مذہب کے نام پر لوگوں کو برطانیہ کے خلاف منظم کرنے کے لئے استعمال کرنا اُلٹا اثر دکھائے گا۔'' انہوں نے مشہور فقرہ کہا کہ ''مسٹر گاندھی ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست میں روحانیت کا عنصر شامل کررہے ہیں۔''

بعدازاں گاندھی نے ہندو علامتیں اختیار کرنا شروع کردیں اس لئے نہیں کہ وہ ہندو علامتیں ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ اکثریتی لوگوں کی علامتیں ہیں اس لئے کہ ان میں منظم کرنے کی زیادہ طاقت ہے۔ اس عمل میں مسلم کمیونٹی یہ دیکھ کر خوفزدہ ہوگئی کہ ان کی ثقافتی اقدار کو جو مشترکہ ثقافت کا جزو تھیں علیحدہ کیا جارہا ہے۔ یہ اس لئے نہیں تھا کہ گاندھی ہندو یا فرقہ پرست تھے بلکہ وہ سامراج مخالف موقع شناس تھے اور اپنے عدم تشدد کے فلسفے کے لئے، جو عوام کو منظم

کرنے کا محرک تھا وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔

س: لگتا ہے آنے والے واقعات کا یہ نقطۂ آغاز تھا۔ اس میں داخلی تضاد موجود تھا۔ گاندھی ایک طرف ایک شاہی نظام، برطانوی راج، کے نکتہ چیں ہیں اور دوسری جانب ایک فرسودہ اور ٹوٹ پھوٹ کے شکر ترک عثمانی سلطنت کے حامی ہیں وہ ایک شاہی نظام کی مدد کرتے ہوئے دوسرے شاہی نظام، برطانوی راج کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

ج: وہ برطانوی راج کے خاتمے کے لئے ہندوستان کی مسلمان آبادی کو منظّم کرنا اور نوآبادیاتی نظام مخالف تحریک کی کامیابی کے لیے ہندو مسلم اتحاد قائم رکھنا ضروری جانتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک ایسے وقت جب ہندوستانی مسلمانوں کی توجہ تحریک خلافت پر مرکوز تھی۔ انہیں یہ بتانا ضروری تھا کہ ''دیکھئے اس مسئلے پر ہم بھی آپ کے طرفدار ہیں ہم آپ کے مقصد کی حمایت کرتے ہیں۔ تاہم گاندھی یہ بھول گئے تھے کہ اس کا اثر کیا ہوگا؟ ان کے مقابلے میں محمد علی جناح کچھ اور سوچ رہے تھے۔

ٹیگور نے محسوس کیا کہ گاندھی کی عدم تعاون کی تحریک بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہم تقسیم کرنے کا موجب ہوگی۔ ہندوستانی معاشرے پر اس سے گہرے زخم لگیں گے، ٹیگور کی سوچ کو سمجھنے کے لئے ان کے ناول ''ہوم اینڈ دی ورلڈ'' اور اسی نام سے بننے والی سیتہ جیت رائے کی فلم دیکھی جا سکتی ہے۔(2)

1920ء میں ٹیگور نے دلیل دی کہ نیشنلزم علیحدگی اور تقسیم کے جذبات پیدا کرتا ہے جن کی بنیاد اشتراک نہیں بلکہ اختلافات ہیں۔ عدم تشدد کی بنیاد بھی مذہبی علامت پر ہے اس لئے یہ بھی ہندوستان میں تشدد کے بیج بونے کا سبب بنے گا عدم تشدد کی جڑوں میں تشدد پوشیدہ ہے۔ عدم تشدد جس کا گاندھی وسیع پیمانے پر پرچار کر رہے ہیں گاندھی کی عدم تعاون کی تحریک جس میں درآمدی چیزیں جلائی جاتی ہیں تمام طبقوں کو یکساں طور پر متاثر کرے گی۔ بنگال میں غریب مسلمانوں پر درمیانے طبقے کے ہندوؤں کی طرف سے افتاد پڑے گی اس لئے کہ بنگال میں انہی کو غالب حیثیت حاصل ہے۔

جولائی 1921ء کے وسط میں گاندھی کلکتے میں ٹیگور کے مکان پر بیٹھے تھے۔ گاندھی کہنے لگے ''گرودیو، میں ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں'' ٹیگور نے کہا ''برطانوی چلے جاتے ہیں یا ہم نیشنلسٹ انہیں نکال باہر کرتے ہیں تو اس وقت کیا ہوگا؟ گاندھی نے

کہا ''لیکن گرودیو، میرا سوراج حاصل کرنے کا پروگرام عدم تشدد کے اصول پر مبنی ہے'' ٹیگور بولے گاندھی جی ذرا میرے برآمدے کے کنارے سے پرے نظر دوڑائیے۔ آپ کے نام نہاد عدم تشدد کے پیروکار کیا کر رہے ہیں؟ ٹیگور نے گاندھی کو بازار دکھایا جہاں عدم تشدد کے حامی کپڑا اجلا رہے تھے اور کہا، کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ ہمارے متشدد جذبات کو آپ کے عدم تشدد کے اصول روک سکتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ نہیں، آپ بھی جانتے ہیں کہ ایسا کرنا ممکن نہیں'' ٹیگور انہی خطوط پر آئندہ دو برس تک بات چیت کرتے رہے اور دلائل دیتے رہے۔26 برس بعد 1947ء میں کیا ہوا وہی کچھ ہوا جو ٹیگور کہتے آئے تھے وہ مہاتما گاندھی سے زیادہ بہتر جانتے تھے۔

س: بہرحال گاندھی اور ان کی تحریک بعض ممتاز مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب رہی۔ مثال کے طور پر آپ نے آزاد کا ذکر کیا ہے بادشاہ خان اور دوسرے بھی تو تھے۔ اس ضمن میں آپ کا کیا رائے ہے؟

ج: پہلی بات تو یہ ہے کہ زیادہ تر مسلمان لیڈر انڈین نیشنل کانگریس اور گاندھی کے طرف دار تھے۔ مولانا آزاد کے علاوہ مولانا حسین احمد مدنی تھے۔ یہ سب عظیم مذہبی علماء تھے۔ جدید ہندوستانی تاریخ میں اس حقیقت کی توجیہہ ممکن نہیں کہ ہندوستان کے مسلمان مذہبی سکالروں نے پاکستان کے تصور کی شدید مخالفت کی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ علماء کا ایک طبقہ مسلم قوم پرستی کو غیر اسلامی نظریہ سمجھتا تھا کیونکہ نیشنلزم سرحدوں کے قیام کا محرک ہوتا ہے جبکہ اسلام سرحدوں کا قائل نہیں۔ یہ قرآن کے ہمہ گیری اور عالمگیری کے تصور سے متصادم ہے۔ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جسے سرحدوں کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرا طبقاتی مسئلہ تھا۔ پاکستان کے مسلم نیشنلزم کے بیشتر داعی متوسط طبقے کے مغرب نواز لوگ تھے۔ علماء ابھرتی ہوئی مڈل کلاس سے خائف تھے، جو تعلیمی نقطۂ نظر، تربیت اور کلچر کے لحاظ سے علماء سے مختلف تھے۔ اس لئے وہ ان سے علیحدگی اختیار کرنے کا رجحان رکھتے تھے۔

س: اگر گاندھی کانگریس پارٹی کی فرقہ واریت کی علامت تھے تو کیا جواہرلال نہرو کو سیکولر لیڈر قرار دینا مناسب ہے؟

ج: گاندھی نہ تو فرقہ پرست تھے اور نہ ہی فرقہ پرستی کی علامت تھے۔ گاندھی کی سیاست اور کلچر جو انہوں نے غیر شعوری طور پر نہ جانتے ہوئے اور غیر ارادی طور پر پیدا کیا فرقہ پرستی

اُبھارنے کا سبب بنا۔اس سے مسلمانوں کی طرف بھی اور ہندوؤں کی طرف بھی فرقہ پرستی کو ہوا ملی، وہ خود اس کے کبھی فریق نہیں بنے، ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں جانب کے فرقہ پرست لوگ ان سے نفرت کرتے تھے کیونکہ ان کے اندر وہ ایک عام شخصیت کی جھلک دیکھتے تھے۔گاندھی ہندو بنیاد پرست جماعت راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے ایک رکن کے ہاتھوں قتل ہوئے، گاندھی نے مرتے دم ''ہے رام'' کہا جبکہ ان کا قاتل بھی رام کو ماننے والا تھا۔

نہرو مغربی رنگ میں پوری طرح رنگے ہوئے، نیشنلسٹ لیڈر تھے جو انڈین نیشنل کانگریس کے تحت ہندوستان کو سیکولر ریاست بنانے کا واضح عزم رکھتے تھے۔بحیثیت انسان میرے دل میں نہرو کی عزت زیادہ ہے اس کے باوجود ہمیں ماننا چاہیے کہ نہرو کے دور میں بعض باتیں نہیں ہونی چاہیں تھیں وہ ان سے بچتے تو اچھا تھا۔

ابتدائی ایام میں ہندوستان کے صدر راجندر پرشاد تھے انہوں نے اپنے طور پر ریاست گجرات میں سوم ناتھ کا مندر پھر سے تعمیر کرنے اور اس کے افتتاح کی تقریب منانے کی ذمہ داری قبول کی۔ اس وقت نہرو خاموش رہے۔ وہ صدر راجندر پرشاد کے خیال کی مخالفت نہ کر سکے۔انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔یہ ریاست کا کام نہیں کہ وہ ایک ہزار یا دو ہزار سال پہلے کی غلطیوں کی اصلاح کرنے لگے، یہ ریاست کا کام نہیں کہ مذہبی نوعیت کی تاریخی غلطیوں کی تصحیح کرتی پھرے۔میں 1990ء تک اس صورتحال کو سمجھ نہیں سکا۔

1992ء میں ایودھیا، اتر پردیش میں تاریخ بابری مسجد تباہ ہوئی تو سوچ رہا تھا کہ اس واقعہ کی غیر معمولی حیثیت کیا ہے؟ انتہا پسند، بابری مسجد کو تباہ کر رہے تھے تو مجھے یاد آرہا تھا کہ یہ بات کانگریس پارٹی نے سوم ناتھ کا مندر تعمیر کرنے کا عزم کر کے شروع کی تھی۔

س: 1947ء سے پہلے کے دور میں برطانوی راج کے طور پر طریقوں اور حیلہ جوئیوں کا کیا عالم تھا؟ کیا وہ تقسیم کرو اور راج کرو کے اصول پر عمل پیرا تھے!

ج: یہ نیشنلسٹ دلیل یا خیال ہے کہ برطانیہ ہندوستان کو پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کرنا چاہتا تھا اور اس نے اس کام میں مدد دی، میں تاریخ کا اس انداز سے مطالعہ نہیں کرتا۔لیکن برطانیہ نے ہندوستان کو فرقہ وارانہ خطوط پر ضرور تقسیم کیا۔خاص طور پر 1757ء اور 1920ء کے دوران، برطانیہ کے تقسیم کرو اور راج کرو کے طریق میں کوئی رخنہ نہیں پڑا، یہ مسلسل

جاری رہا۔ جداگانہ رائے دہندگی کی بنیاد ڈالی گئی۔1757ء اور1857ء کے درمیانی عرصے میں جب مسلمانوں نے برطانوی راج کی مخالفت کی تو ان سے امتیازی سلوک کیا گیا اور ہندوؤں کو آگے لانے میں مدد دی گئی۔ جب کانگریس منظّم ہوئی تو اس میں مسلمانوں سے زیادہ ہندو نیشنلسٹ تھے اس کے بعد برطانیہ نے کانگریس کے خلاف مسلمانوں کی حمایت کی۔ اس طرح تقسیم کرو اور راج کرو کی ایسی پالیسیاں زیرِعمل آئیں جو دو صدیوں تک رائج رہیں۔

میرا خیال نہیں کہ ان میں کوئی توسیع ہوئی اور واقعی پاکستان اور ہندوستان کے درمیانی لکیر کھینچی گئی۔ ہوا یہ کہ باری باری دو وائسرائے آئے، لارڈ ویول پہلے آئے لیکن انہیں جلد ہی واپس بُلا لیا گیا۔ ان کی جگہ لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن نے لی۔ لگتا ہے کہ ویول نے ہندوستان کو کسی نہ کسی طرح متحد رکھنے کے لئے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان معاہدہ کرانے کا اقدام کیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے جو برطانیہ کی لیبر حکومت کی پسند تھے انہوں نے یہ انتظار کئے بغیر کہ ہندوستان کو متحد رکھا جا سکتا ہے اور متوقع قتل و غارت گری سے بچا جا سکتا ہے تقسیم کے عمل کو تیز کیا۔ انہوں نے ہندوستان کی تقسیم میں جلد بازی کیوں کی؟ یہ بڑا دلچسپ سوال ہے میں برطانیہ کے اس موقف کو غلط ثابت کرنے کے لئے ضروری مواد حاصل نہیں کر سکا کہ ہندوستان کی تقسیم، برطانیہ کی پالیسی کا حصہ نہیں بلکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ذاتی خواہش کا نتیجہ تھی۔ یہ برطانیہ کا موقف ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ برطانیہ نے طویل عرصے تک تقسیم کرو اور حکومت کرو کے اصول پر عمل پیرا رہ کر ہندوستان کی تقسیم کی بنیاد ڈال دی تھی جب بحران نے شدت اختیار کی تو برطانیہ نے ہندوستان کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ نہیں کیا۔

س: تاریخی واقعات پر ایک نظر ڈالتے ہوئے دیکھنا چاہیے کہ دوسری جنگ عالمگیر کے دوران برطانوی طاقت پر جرمنی اور جاپانی حملوں کا نیشنلسٹ تحریکوں پر کیا اثر ہوا؟ کیا اس سے ہندوستان کے نیشنلسٹوں پر واضح ہوا کہ برطانوی سلطنت ختم ہو سکتی ہے؟

ج: نہیں، ایسا نہیں ہوا۔1904ء۔1905ء کی روس جاپان کی جنگ کا اثر دوسری عالمی جنگ سے بھی زیادہ ہوا تھا۔

س: ٹیگور کا بھی یہی موقف ہے۔

MashalBooks.org

ج: جی ٹیگور بھی یہ کہتے ہیں۔ سینکڑوں برس میں روس اور جاپان کی جنگ، پہلی جنگ تھی جس میں غیر مغربی فوج نے ایک مغربی فوج کو مکمل شکست دی تھی۔ ایشیائی عوام کو سینکڑوں برس سے یہی بتایا جا رہا تھا اور اس کے لئے لٹریچر، گیتوں، ناولوں اور دوسرے ذرائع سے یہی باور کرایا جا رہا تھا کہ ان کو اس لئے نوآبادیاتی نظام کا تابع بنایا گیا کہ وہ کم تر اور حقیر تھے۔ وہ اسی لئے نوآبادیاتی نظام کی جکڑ میں آئے کیونکہ وہ نسلی اعتبار سے پسماندہ تھے، سائنسی لحاظ سے بچھڑے ہوئے تھے، وہ تنظیمی لحاظ سے پست تھے، وہ جنگ کے طریقوں سے ناآشنا تھے، وہ سٹریٹجی، جنگی چالوں اور سامان حرب کے اعتبار سے تہی دست تھے، لیکن اچانک انہوں نے دیکھا کہ ایک ایشیائی طاقت نے ایک مغربی طاقت کو پچھاڑ دیا۔ اس کا بہت اثر ہوا۔ اس زمانے میں لارڈ کرزن، ہندوستان کے وائسرائے تھے انہوں نے برطانوی وزیراعظم کے نام اپنی یادداشت میں لکھا کہ روس پر جاپان کی فتح سے جو لہریں اٹھی ہیں انہوں نے مشرق کی سرگوشیاں کرتی ہوئی گیلریوں میں دھماکوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کا بڑا اثر ہوا۔ ہندوستان برطانیہ کی طرف سے لڑا، ہمارے سپاہی بہادری سے لڑے، وہ یورپی محاذ پر لڑے۔ میدان جنگ میں انہیں دو تجربے ہوئے ایک یہ کہ وہ برطانوی اور یورپی سپاہیوں کے برابر اور ہم پلہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ سلطنت نے ان سے نابرابری کا سلوک کیا۔ محاذ جنگ پر وہ ہر روز دیکھتے کہ وہ دوسروں کے برابر ہیں لیکن ان سے نسلی امتیاز برتا جا رہا ہے۔ چنانچہ جب وہ پہلی جنگ عظیم سے واپس آئے تو غصے سے جل بھن رہے تھے انہوں نے اور ان کے رشتہ داروں نے نیشنلسٹ تحریک کو بڑھاوا دیا۔ ہندوستان میں نیشنلسٹ تحریک کو عوام کی ہمدردی اور حمایت پہلی جنگ عظیم کے بعد ہی حاصل ہوئی۔

س: آیئے اب اگست 1942ء پر نگاہ کریں، جب گاندھی نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک شروع کی اور کہا کہ اب حکومت سے تعاون نہیں ہوگا، ہندوستان، جرمنی اور جاپان کو شکست دینے میں برطانیہ کی کوئی مدد نہیں کرے گا، ان دنوں چرچل برطانیہ کے وزیراعظم تھے انہوں نے اس اعلان کے جواب میں کہا کہ میں ہز میجسٹی کا پہلا وزیر نہیں بنوں گا کہ آدھے ننگے ہندوستانی فقیر (گاندھی) کے ہاتھوں برطانوی سلطنت کا شیرازہ بکھرتا دیکھوں۔ اس میں کیا نزاکت تھی کہ کانگریس کی پوری قیادت نے اجتماعی طور پر میدان، جناح کے لئے

MashalBooks.org

خالی چھوڑ دیا؟

ج: اس سے بھی کہیں زیادہ ہوا، پیچھے مڑ کر دیکھیں تو مجھے لگتا ہے کہ انڈیشن نیشنل کانگریس، خاص طور پر مہاتما جی نے ایک بہت بڑا گھپلا کیا۔1942ء برطانیہ کے لئے ایک سخت مشکل سال تھا، لندن پر سخت بمباری ہو رہی تھی۔ فسطائیت کے خلاف برطانوی جنگ اپنے عروج پر تھی، جاپان نے ہندوستان پر حملہ کر دیا تھا کانگرسی لیڈر شپ میں سے ایک رکن سبھاش چندر بوش محوریوں (جرمنی و جاپان) سے جا ملے تھے اور جاپانی پرچم تلے انڈین نیشنل فوج منظّم کر رہے تھے۔

گاندھی اور کانگریسی لیڈر برطانیہ سے یہ کہنے میں حق بجانب تھے ''ہم جنگ کے لئے کی جانے والی کوشش کی حمایت کریں گے لیکن اس کے عوض آپ وعدہ کریں کہ جنگ کے بعد ہمیں آزادی دے دیں گے، لیکن چونکہ برطانیہ اس کے لئے تیار نہیں تھا اس لئے ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک شروع کرنا حکمت عملی کے خلاف تھا اور ایک فاش غلطی تھی۔

مسٹر جناح نے، جواب مسلم لیگ کے لیڈر تھے اس تحریک کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ایسا کرنے کی دو وجوہ تھیں ایک یہ کہ وہ فسطائیت کے سخت خلاف تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس خاص لمحے میں وہ کچھ ایسا کریں گے جس سے برطانیہ کو نقصان پہنچ سکتا ہو۔ دوسرے مسٹر جناح موقع شناس تھے ان کے لئے یہ موقع تھا جس میں وہ پاکستان کے مطالبے کے لئے برطانیہ کی حمایت حاصل کر سکتے تھے۔ برطانیہ اس سے پہلے اُن پر کبھی مہربان نہیں ہوا تھا چنانچہ دونوں مرحلوں میں کانگریس نے غلطی کی۔

س: مسٹر جناح کو ''فریڈم ایٹ مڈ نائٹ'' کے عنوان سے چھپنے والی کتاب اور فلم ''گاندھی'' میں ایک غیر ہمدرد کردار کے طور پر دکھایا گیا ہے۔(3)

ج: جہاں تک پبلیسٹی کرنے والوں، اور میں کہوں گا کہ جہاں تک مورخوں کا بھی تعلق ہے وہ جناح کے بارے میں سخت نامہربان رہے ہیں۔ جناح آج بھی ایک طرف تو بحث و مباحثہ کا ہدف ہیں، دوسرے یکے بعد دیگرے آنے والے لیڈروں نے بھی پاکستان کا ستیاناس کر دیا ہے۔ جناح گاندھی کی طرح خیال پرست نہیں تھے اور نہ ہی نہرو کی طرح پر کشش، نرم مزاج، مہذب اور متلون تھے۔ جناح ان میں سے کچھ بھی نہیں تھے وہ فرانسیسی فلسفی ڈیکارٹ کے تصور کا نمونہ اور وکٹورین دور کے رکھ رکھاؤ کے پابند، شہری، بیرسٹر اور آئینی

ضابطوں کے سختی سے پابند تھے۔ وہ سیاست اور گفتگو میں حقیقت پسندی کو ملحوظ رکھتے وہ بڑی حد تک عوام سے ایک فاصلے پر رہتے۔ وہ اپنے اکثر برطانوی ہم عصروں کی طرح آزاد خیال اور آئین پسند تھے۔ ان کی ذات کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ وہ ایک کٹر سیکولر نیشنلسٹ سیاست داں تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس میں تمام دوسروں کے مقابلے میں ان کا ایسا مرکزی کردار تھا کہ ہر کوئی انہیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہنے لگا تھا۔ لیکن 1933ء تک آتے آتے وہ صرف مسلمانوں کے مفادات کے محرک اور نقیب بن گئے۔ اس کے بعد 1940ء میں انہوں نے پاکستان کا مطالبہ کر دیا۔ اس سے سات برس بعد انہوں نے یہ مطالبہ حقیقتاً منوا بھی لیا ان کے بارے میں بھلا دیا جاتا ہے کہ اپنی زندگی کے آٹھ برس وہ ہندوستان کے اتحاد کے حامی رہے۔

س: مسٹر جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بن گئے اس کے کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے؟

ج: انہوں نے ایک برس بعد انتقال کیا۔ وہ سخت بیمار تھے کینسر کے مریض تھے یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ انہوں نے اس ایک سال کے دوران جو کچھ کہا اور جو کچھ کیا اس سے عیاں ہے• اور میں پاکستان میں اس کے بارے میں تفصیلی اظہار خیال کرتا رہا ہوں) کہ، جناح ہندوستان کے ساتھ سرحد کھلی رکھنا چاہتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ پاکستان کے تمام ہمسایوں کے ساتھ امن کے حامی تھے۔ میرے خیال میں جو کچھ اب ہو رہا ہے اس کا انہیں خیال تک نہ آیا ہو۔ میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتانا چاہتا ہوں یہ کہ جناح بہت امیر تھے وہ کامیاب وکیل تھے انہوں نے سترہ برس انگلستان میں وکالت کی اور خاصی دولت کمائی۔ انہوں نے اپنے وصیت نامے میں جو انہوں نے خود لکھا اپنی دولت کا زیادہ تر حصہ ہندوستانی اداروں کے لئے مختص کیا۔ پاکستانی اداروں کے لئے بہت کم حصہ رکھا۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے۔

جناح سوچ سمجھ کر سرمایہ لگایا کرتے تھے حیران کن بات یہ ہے کہ 1945ء سے 1947ء تک انہوں نے جتنا بھی سرمایہ لگایا، لاہور میں ایک چھوٹی سی جائیداد اور کراچی کی ایک معمولی سی جائیداد کے سوا انہوں نے دولت کا بڑا حصہ پاکستان میں نہیں ہندوستان میں لگایا۔ ان کی بیشتر سرمایہ کاری ان کمپنیوں میں تھی جو پاکستان کی نہیں ہندوستان کی حصہ بنیں۔ انہیں علم تھا کہ یہ کمپنیاں ہندوستان میں رہیں گی، اس اعتبار سے وہ ایک دلچسپ شخصیت کے مالک

MashalBooks.org

تھے ویسی نہیں جو پروپیگنڈہ کرنے والوں نے پیش کی ہے سٹینلے والپرٹ نے ان کی جو سوانح حیات لکھی ہے وہ بہت اچھی اور پڑھنے کے لائق ہے۔(4)

س: شاعر اور فلسفی علامہ محمد اقبالؒ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے وہ1938ء میں انتقال کر گئے تھے۔ پاکستان میں ان کی یاد قومی شاعر کی حیثیت سے منائی جاتی ہے۔

ج: محمد اقبالؒ نابغہ عبقری نادرِ روزگار اور عظیم شاعر تھے انہوں نے اردو شاعری اور کسی حد تک فارسی شاعری کو ایک تاریخی حیثیت اور اہمیت دلائی۔ اقبال سے پہلے اردو، حتیٰ کہ فارسی شاعری کا تعلق ادب کی اس اقلیم سے تھا جس کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں تھا اگر تھا بھی تو غیر محسوس سا، اقبال نے اردو شاعری کو تاریخ میں شامل کیا۔ اس اعتبار سے فیض احمد فیض، جن کا انتقال1984ء میں ہوا، ان کے جانشین شاعر کہے جا سکتے ہیں۔

ان کی دوسری اہم خوبی یہ ہے کہ انہوں نے اردو زبان اور شاعری کو وسعت دی، اتنی نہیں جتنی فیض نے ان کے بعد دی۔ تاہم اقبالؒ نے شاعری کے موضوعات میں ہی تبدیلی نہیں کی ان کی جگہ معاشرتی مسائل کو موضوع سخن بنایا اور اظہار کے پیرائے میں بڑی حد تک تبدیلی کر دی۔ محبت سے ہٹ کر بھی انہوں نے اپنے موضوعات کے ساتھ پوری توانائی اور جوش و جذبے کے ساتھ انصاف کیا ہے اس لحاظ سے انہوں نے اردو شاعری کو بڑی وسعت سے آشنا کر دیا۔

اقبال جرمن روایت کے مطابق اصلاً طبعی اور جبلی صاحب فکر و نظر تھے ان کا فلسفیانہ نقطۂ نظر اتنا دلچسپ نہیں جتنی یہ حقیقت کہ وہ آخری عظیم صوفیاء میں سے تھے میرے خیال میں ان کی صوفیانہ شاعری طویل عرصے تک زندہ رہے گی۔

حال ہی میں، میں بی بی سی (5) کے لیے نیشنلزم پر ایک ڈاکومنٹری بنا رہا تھا میں اس میں ایک ایسا جزو شامل کرنا چاہتا تھا جو بدقسمتی سے فلم میں نہیں آیا کہ پاکستان میں یوم اقبال سرکاری طور پر پاکستان کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے اس لئے کہ اقبال کو ایک ایسے شخص کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے جس نے نظریہ پاکستان دیا کئی لحاظ سے وہ پاکستان کے بانی ہیں انہوں نے جناح سے پہلے پاکستان کے بارے میں سوچا تھا۔

س: لیکن وہ ایک ایسے شاعر بھی ہیں جو ''سارے جہاں سے اچھا، ہندوستان ہمارا'' کہتے ہیں۔(6)

MashalBooks.org

ج: بالکل، لیکن آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ پاکستان میں انہیں پاکستانی نیشنلزم کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں 26 جنوری کو یوم جمہوریہ پر ہندوستانی فوج ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' کی دھن بجاتی ہے۔ میرے علم میں آیا ہے کہ ہندوستانی پارلیمنٹ میں اسے دو ووٹوں کی کمی کے سبب سے قومی ترانہ قرار نہیں دیا جاسکا۔ ہندوستان کو قومی ترانے کے لیے ٹیگور کے گیت پر اکتفا کرنا پڑا۔ بنگلہ دیش کو بھی ٹیگور ہی کا گیت قومی ترانہ بنانا پڑا۔ ٹیگور نیشنلزم کے مخالف تھے لیکن جنوبی ایشیا کے دو ملکوں نے ان کے گیتوں کو اپنا اپنا قومی ترانہ قرار دے دیا۔ اقبال کوئی قومی ترانہ نہیں دے سکے کیونکہ انہوں نے جو ترانہ لکھا اُسے صرف ہندوستان ہی اپنا سکتا تھا۔

س: اب ہندوستان اور تقسیم کی سیاست کی طرف آتے ہیں! کیا برصغیر، فلسطین اور آئرلینڈ سے برطانیہ کے اچانک اور فوری طور پر نکل جانے میں کوئی مطابقت ہے؟ کیونکہ اس کے نتیجے میں بڑی افسوسناک سیاسی صورتحال اور بڑے گمبھیر مسائل پیدا ہوئے۔

ج: اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ دوسری جنگ عالمگیر نے برطانیہ کی شاہی ہمت پست کردی تھی اس سلسلے میں طرح طرح کی باتیں ہوتی رہی ہیں کہ برطانیہ نے مشرقِ وسطیٰ، ہندوستان اور پاکستان سے اپنے انخلا کا منصوبہ بنایا تھا، وہ تمام معاملات امریکی امپریلزم کے ہاتھ میں سونپ کر، امریکہ کے حواری کے کردار پر قناعت کرنا چاہتا تھا۔ وہ جو کام نہیں کرسکتا تھا امریکہ سے کروانا چاہتا تھا لیکن اس مفروضے کو نہیں مانتا۔

1914ء سے 1939ء تک آپ نے برطانیہ کو قدم جمائے رکھنے کا ایک خاص انداز اپناتے ہوئے دیکھا یہ کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے اُسے مختلف حیلوں سے اور کسی حد تک اندھی طاقت سے قبضے میں رکھو۔ جن علاقوں میں توانائی کے وسائل مرتکز تھے برطانیہ نے پوری قوت سے ان پر قبضہ کئے رکھا اُن کی معیشت کے لیے کوئلے کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی کیونکہ وہ توانائی کا وسیلہ نہیں رہا تھا۔ پہلی، دوسری عالمی جنگوں میں برطانیہ کو تیل کی اہمیت کا صحیح اور گہرا اندازہ ہوا۔ اب انہیں دو باتوں سے دلچسپی تھی ایک تیل اور دوسرے انگریز عوام، اس لئے جہاں کہیں کوئی بڑی انگریزی نوآبادی تھی مثلاً کینیا، وہ اس پر قابض رہے جہاں جہاں تیل تھا ان کا قبضہ برقرار رہا ہندوستان کی طرح کی جگہوں کے بارے میں وہ کم توجہ دینے لگے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ 1946ء میں میرے بھائی کہتے تھے کہ برطانیہ کے لئے سب سے برا یہ ہوگا کہ وہ مناسب وقت سے پہلے یہاں سے نکل جائے۔ اس لئے نہیں کہ وہ ہمیں آزادی دینا چاہتا ہے بلکہ اس لئے کہ اُس کے پاس اب اتنی طاقت بھی نہیں کہ یہاں رہ کر اپنے پُرامن انخلاء کا بندوبست کر سکے۔ یاد رہے کہ میرے بھائی وغیرہ نیشنلسٹ تھے۔ ہم نے 1947ء میں پھر 1948ء میں اسے بعجلت سوچے سمجھے بغیر غیر ذمہ دارانہ انداز سے بلکہ سچ پوچھا جائے تو نہایت بزدلی سے یہاں سے نکل بھاگتے دیکھا:

س: 1947ء میں تقسیم کے دوران کتنے لوگ مارے گئے؟ اس کے بارے میں کوئی لائق اعتماد اعداد و شمار ہیں؟

ج: کوئی لائقِ اعتماد تعداد معلوم نہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ سب تخمینے غلط ہیں کہا جاتا ہے کہ چالیس یا پچاس لاکھ افراد ہلاک ہوئے تباہی کے حجم کو دیکھا جائے تو اس لحاظ سے پانچ لاکھ افراد ہلاک ہوئے، لیکن یاد رکھئے کہ دو کروڑ بیس لاکھ افراد بے گھر ہوئے۔ ایک جگہ سے اُجڑ کر دوسری جگہ جانے پر مجبور ہو گئے۔ اب تک کی تاریخ میں یہ سب سے بڑی ہجرت تھی۔

کشمیر کے لئے جدوجہد

س: برصغیر میں تنازعات کا دور جاری ہے۔ جنگوں اور اسلحے کی دوڑ بھی جاری ہے اور سدابہار مسئلہ کشمیر بھی۔

ج: تین جنگیں ہوئیں 1948ء 1965ء اور پھر 1971ء سے 1972ء تک۔ کشمیر کی کشمکش جاری ہے جس کے لئے کشمیری عوام کو بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ اسلحے کی دوڑ بھی جاری ہے جواب ایٹمی شکل اختیار کر چکی ہے۔ سب سے بُری بات یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان مزائیل بنانے میں مصروف ہیں، اسلحے کی دوڑ، مزائیلوں کے اضافے کے باعث اور زیادہ سنگین ہوگئی ہے۔ مزائیلوں کی تیاری کی کوئی حد نہیں ایک کے بعد دوسری بنتی چلی جائیں گی کوئی چھوٹے فاصلے تک مار کرنے والی، کوئی دور کے فاصلے تک نشانہ لینے والی۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ایک ایسا مسئلہ جسے عام طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہجرت نے ایک ایسی کمیونٹی پیدا کر دی ہے جو ابھی تک آباد ہونے اور اپنے نئے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے اس نے معاشرتی آویزش

کا ماحول پیدا کر دیا۔

س: ہندوستانی حکومت کشمیریوں کا حق خودداری تسلیم کرنے سے انکار کرتی چلی آرہی ہے ان کا کہنا ہے کہ 1947ء میں جب مہاراجہ نے انڈین یونین سے الحاق کیا تھا تو اس کے ساتھ ہی یہ مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

ج: یہ ہندوستان کی سرکاری پوزیشن ہے پاکستان بھی یہی کہتا ہے کہ لیکن قدرے کم خطرناک طور سے۔ حکومت پاکستان کا موقف ہے کہ کشمیریوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ اپنے حق خودارادیت کے استعمال کے ذریعہ فیصلہ کریں کہ انہیں ہندوستان کیساتھ رہنا ہے یا پاکستان کے ساتھ۔ یہ حق اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی 1948ء کی قرارداد میں رقم ہے اس لئے پاکستان کا اصرار ہے کہ اقوام متحدہ کی قرارداد کی بناء پر ریفرینڈم یا رائے شماری کرائے جائے جس کی بنا پر کشمیری ہندوستان اور پاکستان میں سے کسی کو چُن لیں،

پچاس برس گزرنے کے بعد کشمیریوں کو دونوں ملکوں سے زیادہ سے زیادہ خودمختاری لینے یا پھر آزادی حاصل کرنے سے دلچسپی ہوگئی ہے۔ پاکستان اسے ماننے کے لئے تیار نہیں۔ پاکستان اور ہندوستان کے موقف میں فرق یہ ہے کہ ہندوستان وادی کشمیر پر قابض ہے، جہاں 1989ء سے عوام نے بغاوت کر رکھی ہے۔ اب تک پچاس ہزار کے قریب افراد ہلاک ہو چکے ہیں زیادہ تر ہلاکتیں ہندوستانی فوج کے ہاتھوں ہوئیں۔ ہندوستان کے انکار کے نتیجے میں جانی نقصان اور جائیدادوں کی تباہی ہو رہی ہے جبکہ پاکستان کے دیرینہ موقف کی بناء پر اتنا نقصان نہیں ہوا۔ میں ہندوستان اور پاکستان دونوں سے کہتا ہوں کہ کشمیریوں کو موقع دیں کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔ یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے مفادات پر زد نہ آئے۔

س: نہرو نے استصواب (رائے شماری) پر رضامندی ظاہر کی تھی لیکن اس پر عمل نہیں کیا تاخیر برتی جاتی رہی دیر ہوتی رہی اور رائے شماری کی نوبت نہیں آئی۔

ج: وزیراعظم نہرو کے تحت ہندوستان نے اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق استصواب (رائے شماری) کا وعدہ کیا تھا۔ ہندوستان اس وعدے سے منحرف ہو گیا۔

س: پاکستان اور بھارت میں لسانی نیشنلزم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ پاکستان میں زیادہ فارسی اور عربی الفاظ اور محاورات استعمال ہونے لگے ہیں ہندوستان میں عام بول

چال کی زبان کی جگہ سنسکرتی ہندی رائج کر دی گئی ہے؟

ج: ایسا ہی ہوا ہے آپ کا مشاہدہ صحیح ہے۔ آزادی سے پہلے بیس برسوں میں یہی کچھ ہوا ہے نیشنلزم نئے حقائق تخلیق کرنے کی کوشش میں تھا پاکستانی نیشنلزم نے اردو کو اپنی قومی زبان قرار دے لیا اس طرح ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔1947ء سے1970ء تک آدھے سے زیادہ ملک (مشرقی پاکستان) میں بنگالی یا بنگلہ بولی جاتی تھی، بنگالی ترقی یافتہ زبان ہے کم از کم اردو جتنی ہی ترقی یافتہ، اس نے ٹیگور جیسے بڑے شاعر اور بنکم چندر جیسے ناول نگار پیدا کیئے، بنگالی اپنی زبان رکھنا چاہتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ جب پاکستان کی حکومت نے جس پر اردو بولنے والے مہاجروں کا غلبہ تھا، اردو کو قومی زبان کے طور پر نافذ کرنے کی کوشش کی تو بنگالیوں نے مزاحمت کی۔ پاکستانی نیشنلزم کو تقویت پہنچانے کی بجائے اردو کے قومی زبان کے طور پر نافذ ہونے سے ملک تقسیم ہو گیا اس نے پاکستان کے اتحاد کو ختم کر دیا اس سے بنگلہ دیش کی ایک آزاد ملک کی حیثیت سے علیحدگی کو تحریک ملی۔

ہندوستان میں اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھا گیا اس لئے قدیم ہندوستانی میں زیادہ سے زیادہ سنسکرت کے الفاظ شامل کیئے گئے۔ اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا، کیونکہ اردو کے بارے میں اصل سچ یہ ہے کہ یہ مسلم یا ہندو زبان نہیں، یہ دونوں عوام کی ایک مشترک زبان بنانے کی ضرورت کے سبب سے بنی، یہ اسلام اور ہندوستان کے دیانتدارانہ، حقیقی، بامقصد اور تخلیقی میل ملاپ سے بنی۔ پاکستان میں اسے ہم اردو کہتے ہیں ہندوستان میں یہ ہندوستانی کہلاتی ہے، میرے نزدیک پاکستان کی ریاستی سرپرستی کے نتیجے میں اردو کو شدید نقصان پہنچا ہے سندھیوں کی طرف سے اردو کی مزاحمت اور بنگالیوں کی جانب سے اردو کی مخالفت جو تقسیم کا سبب بنی اس کا ثبوت ہے۔ ہندوستان میں ہندی کے سرکاری زبان بننے سے یہ مسئلہ پیدا ہوا اردو کو دونوں ملکوں میں نقصان اٹھانا پڑا سرکاری مخالفت کے باعث اور پاکستان میں سرکاری سرپرستی کے سبب سے، بنیادی طور پر اردو ہندوستان اور پاکستان دونوں میں ایک خاص تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہے۔

اردو پاکستان میں عام بولی جاتی ہے لیکن یہ ریڈیو پاکستان کی اردو سے مختلف ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مختلف زبانوں کے الفاظ شامل ہیں پنجابی، سندھی بلوچی اور انگریزی کے بیشتر الفاظ اس میں داخل بلکہ جذب ہو چکے ہیں۔ اس طرح یہ پاکستان کی منڈی کی

زبان بن چکی ہے۔ یہ سکولوں اور یونیورسٹیوں میں ادبی زبان کے طور پر رہی ہے لیکن عام لوگوں میں بول چال کی زبان کے طور پر وسعت اختیار کرتی جا رہی ہے ہندوستان میں اردو نام نہاد بالی وڈ کی فلموں کے ذریعے پھر سے وسیع پیمانے پر فروغ پانے لگی ہے۔ فلموں کے سارے گیت اردو میں ہیں، مکالمے اردو میں ہیں، سچ تو یہ ہے کہ جہاں افسروں نے اردو اور ہندوی کی سرپرستی کی اور انہیں قومی زبان بنانے کا تاثر دیا وہاں عوام ایسی زبانیں بنا رہے ہیں جو پاکستان اور ہندوستان میں مشترک اور بول چال آسان وسیلہ ہیں۔

س: اب کشمیر کی طرف آتے ہیں آپ اس مسئلے کا کیا حل تجویز کرتے ہیں؟

ج: میں نے کسی حد تک رائے دی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کو کشمیریوں کی تحریک کے رہنماؤں سے مل کر مسئلے کا حل تلاش کرنے کا طریقہ سوچنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہمیں پسِ منظر پر بھی نظر کرنی چاہیے۔

1948ء سے کشمیر ہندوستان اور پاکستان میں منقسم چلا آ رہا ہے پاکستان کی طرف کا علاقہ جو آزاد کشمیر کہلاتا ہے بنیادی طور پر پنجابی بولنے والوں کا علاقہ ہے مظفر آباد اس کا دارالحکومت ہے۔ اس کی اپنی خودمختار حکومت ہے جو مقامی امور پر خودمختاری برتتی ہے اس کی خارجہ پالیسی، دفاع اور تجارتی حکومت عملیاں پاکستان کے کنٹرول میں ہیں ایک طرح سے اس کی خودمختاری محدود ہے۔

باقی ماندہ کشمیر ہندوستان کے کنٹرول میں ہے یہ تین حصوں میں بٹا ہوا ہے اس میں وادی ہے جس کی اسی سے پچاسی فیصد آبادی مسلمان ہے جو دو صدیوں سے کشمیر کے مہاراجہ کے ہاتھوں جسے برطانیہ نے اقتدار دیا تھا، ناانصافی، ظلم و زیادتی اور امتیازی سلوک برداشت کرتے آئے ہیں۔ دونوں حکومتیں مسلمانوں سے اس حد تک امتیاز روا رکھتی ہیں کہ اُن کی حالت کھیت مزدوروں یا غلاموں سے کسی طرح بھی بہتر نہیں تھی انہیں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

1948ء کے بعد سے صورتحال بہتر ہوئی ہے زیادہ کشمیری سکولوں میں تعلیم پانے لگے، وادی میں جس کی آبادی چالیس لاکھ کے لگ بھگ ہے ایک طرح کا کشمیری نیشنلزم ابھرنے لگا ہے وادی کشمیر کا ایک نمایاں پہلو کشمیریات یعنی کشمیری نیشنلزم اور کشمیری جذبات و خواہشات کا مرکز ہونے کا ہے۔

پھر یہاں لداخ ہے۔ جہاں زیادہ تر بودھ آباد ہیں کچھ حصوں میں مسلمان بھی آباد ہیں لداخ چین سے ملتا ہے اس لئے ہندوستان اپنے دفاع کے لئے اسے نہایت اہم سمجھتا ہے جموں کا ضلع ہے۔ جہاں ساٹھ فیصد ہندو ہیں جو کشمیری زبان نہیں جانتے وہ مذہب سے زیادہ اپنے نسلی امتیاز کو اہم جانتے ہیں وہ ڈوگرہ ہیں مہاراجہ بھی ڈوگرہ تھا، اس لئے انہیں خصوصی مراعات حاصل رہیں وہ ایک الگ زبان ڈوگری بولتے ہیں وہ اپنے آپ کو ہندوستان کے زیادہ قریب سمجھتے ہیں وہ کشمیریات کی اساس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

اس تقسیم کو ملحوظ رکھنے کی بنا پر کشمیر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان بٹا ہوا ہے جو حصہ ہندوستان کے قبضہ میں ہے وہی سخت متنازعہ ہے وہیں پر لوگ آمادہ ءبغاوت ہیں اور اسی کی بنا پر کشمیر تین حصوں میں بٹ جاتا ہے وادی، لداخ اور جموں۔ میری تجویز یہ ہے کہ ایک ایسا معاہدہ کیا جائے جس کے تحت پاکستانی حصہ پاکستان کے کنٹرول میں رہے۔ لداخ اور جموں جو کشمیریات یا کشمیر نیشنلزم پر یقین نہیں رکھتے اس پر بھارت کی خودمختاری رہے وادی کو آزادی دے دی جائے۔ لیکن کشمیری قیادت، پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ہونے والے ایک معاہدے کی رو سے تین حصوں کی خودمختاری کے باوصف کشمیر متحد رہے۔ اس علاقے کو متحد رکھا جائے۔ خودمختاری کو منقسم رکھا جائے۔ آج کے دور میں یہ ممکن بھی ہے۔ لائن آف کنٹرول ختم کردی جائے سرحدوں پر سے فوجی کنٹرول موقوف ہوجائے، تینوں حصوں کے درمیان تجارت آزاد کردی جائے ہندوستان پاکستان اور آزاد کشمیری حکومت کو اس پہاڑی علاقے کے دفاع کا ذمہ دار قرار دے دیا جائے۔

کشمیر اس وقت ایک طرف پاکستان اور ہندوستان کے درمیان دوسری طرف ہندوستان اور کشمیری نیشنلزم اور پھر ڈوگروں اور کشمیریوں کے درمیان وجہ نزاع بنا ہوا ہے بودھوں اور کشمیریوں کے خدشات الگ ہیں میری تجویز پر عمل کیا جائے تو نزاع کی وجوہ ختم ہو جائیں گی اور امن کا پُل تعمیر کیا جا سکے گا۔ ہر حصے کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری اور منقسم حکومت یا فرماں روائی دے دی جائے۔

اس طرح کشمیر، ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے نقطۂ آغاز بن سکے گا۔ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو طبعی لحاظ سے معمول پر لایا جا سکے گا۔ دونوں ملکوں کے درمیان آزادانہ تجارت ہو سکے گی ہنرمندوں کا تبادلہ کیا جا سکے گا جو سرمایہ اسلحہ جمع

کرنے پر خرچ کیا جارہا ہے اس میں کمی کی جائے گی اور دس برسوں میں ہم مشرقی ایشیاء کی طرح نظر آنے لگیں گے۔ ہم بہت کم سرمائے سے ایک دوسرے سے مقابلہ کررہے ہیں۔ ہندوستان کی 950 ملین آبادی میں سے 4 سوملین عوام خطِ غربت یا خطِ افلاس سے نیچے زندگی بسر کررہے ہیں اس صورتحال کو بدلنا ہوگا۔

س: کیا آپ کے خیال میں تنازعہ کشمیر کے حل ہوجانے سے پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات بہتر اور ان کے زخم مندمل ہوجائیں گے؟

ج: وہ کشمیر سے کہیں زیادہ اہم امور پر معاہدے کرسکتے ہیں کشمیر زیادہ سے زیادہ ایک جذباتی مسئلہ ہے۔

ہمارے دریاؤں کے پانی کی تقسیم مرکزی اہمیت کا حامل مسئلہ ہے کیونکہ یہ پاکستان ہندوستانی پنجاب اور ہریانہ کے لئے رگِ حیات کا درجہ رکھتا ہے ہم نے 1960ء میں سندھ طاس کے پانی کا معاہدہ کیا تھا جس پر عمل کیا جارہا ہے عالمی بنک نے یہ معاہدہ کرانے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا یہ عالمی بنک سے ایک اچھی بات سرزد ہوئی تھی، 1996ء میں ہندوستان اور بنگلہ دیش میں گنگا کے پانی کے بارے میں معاہدہ ہوا۔(7)

ہندوستان میں کٹر ہندو نیشنلسٹوں اور پاکستان میں جنگجو قسم کی مذہبی جماعتوں کے سوا سیکولر لوگوں اور عوام میں کوئی مخالفت نہیں ہم ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو معمول پر لانے اور کشمیر کا مسئلہ حل کرنے میں جتنی تاخیر کریں گے اس سے ایک ایسا ماحول پیدا ہوگا جس سے اسلامی اور ہندو انتہا پسندی کو فروغ حاصل ہوگا۔

اعلیٰ تعلیم

س: مجھے ان کوششوں کے بارے میں بتائیے جو آپ اسلام آباد میں ایک آزادی تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی غرض سے کررہے ہیں۔

ج: پاکستان میں اعلیٰ تعلیم مکمل طور پر ناکام ہوچکی ہے، اعلیٰ تعلیم ہندوستان سمیت تیسری دنیا کے اکثر ملکوں میں یا تو کلیتًا ناکام ہوچکی ہے یا ناکام ہورہی ہے۔ ہندوستان میں اعلیٰ درجے کی ٹیکنیکل تعلیم کی تدریس کے لئے ٹیکنالوجی کے چھ انسٹی ٹیوٹ قائم کئے گئے ان میں ادب اور سوشل سائنسز پڑھانے کا کوئی اہتمام نہیں تھا۔ ان اداروں سے انجینئر اور چند سائنس دان ضرور نکلے تاہم ہندوستان میں تعلیم کا معیار بُری طرح گرا ہے۔ اعلیٰ تعلیم

کے معیار کے گرنے کے کئی وجوہ ہے۔ان میں سے ایک نیشنلسٹ حکومتوں کا زبان کے متعلق اُلجھا ہوا اور بعض صورتوں میں غیر تخلیقی رویہ ہے۔نوآبادیاتی نظام کے بعد کے دور کی ریاستوں کی خواہش رہی ہے کہ ایسے لسانی تعصب کو فروغ دیں جو اُن کی نیشنلسٹ ضرورتوں کی تسکین کا موجب ہو۔ پاکستان میں اس ضرورت کے تحت فارسی زدہ اردو ہماری قوم زبان ہے ہندوستان میں یہی حیثیت ہندی زبان کو حاصل ہے اس میں سنسکرت الفاظ اور تراکیب اور محاوروں کی بھرمار کردی گئی ہے۔الجزائز میں عربی ہے۔ یہ ایک طرف تو قومی تعصب کی ضرورتیں ہیں دوسری جانب یہ وہ ملک ہیں جو بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ منڈی سے وابستہ یا منسلک ہیں دوسرے لفظوں میں اُن کا تعلق کسی نئے یا پرانے شاہی ملک سے یعنی برطانیہ یا امریکہ سے، فرانس یا امریکہ سے ہے نتیجہ یہ کہ ان کے ہاں معیاروں کے دو سیٹ ہیں ایک حقیقی دوسرا نظریاتی، الجزائر میں اعلیٰ تعلیم کو عربی میں ڈھالنا ضروری سمجھا گیا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ الجزائر طبعی طور پر فرانس سے بندھا رہا ہے۔اسی طرح اس کا تعلق بین الاقوامی منڈی سے بھی قائم رہا ہے۔ چنانچہ مقامی زبان عربی کی قدر کم ہوگئی تھی نتیجتاً صورتحال یہ ہوئی کہ اعلیٰ تعلیم کے لئے زبان میسر نہیں، ایک مستقل لسانی پالیسی کے بغیر اعلیٰ تعلیم نہیں دی جا سکتی اسی سبب سے تعلیم زوال کا شکار ہوئی۔

دوسرے ہمیں اعلیٰ تعلیم کا نوآبادیاتی نظام ورثے میں ملا ہے۔نوآبادیاتی نظام کے بعد کی حکومتیں تعلیم کا متبادل نظام لانے کی نہ خواہشمند ہیں اور نہ ارادہ رکھتی ہیں۔انہوں نے تعلیمی نظام کے بارے میں جو زبانی کلامی اعلانات کئے وہ تو آزادی سے مربوط دکھائی دیتے تھے لیکن حقیقت میں اعلیٰ تعلیم ،نوآبادیاتی تعلیمی نظام پر ہی قائم رہی اور نوآبادیاتی ریاستی نظام کے تحت نئے حالات میں تعلیمی نظام اس لئے نہ چل سکا کیوں کہ اسے مخالف اور متضاد دباؤ کا سامنا تھا۔

تیسرے یہ کہ نوآبادیاتی تعلیم کے مقاصد مختلف تھے۔ لارڈ میکالے نے کہا تھا ''ہم انڈیا میں اعلیٰ تعلیم کے سکولوں میں ایسی تربیت دینا چاہتے ہیں کہ تربیت یافتہ افراد برطانوی راج اور عوام کے درمیان رابطے کا فرض ادا کرسکیں۔'' (8)

اس تعلیم کا مقصد، تنظیم یا اساتذہ یا ایک آزاد ریاست میں نظم ونسق چلانے کے اہل افراد پیدا کرنا نہیں تھا اس کا ایک ہی مقصد تھا، سلطنت کے خدمت گزار پیدا کرنا۔آج تک ہم بھی

MashalBooks.org

یہی کرتے آ رہے ہیں، لیکن تعلیمی نظام سے یہ توقع نہیں کی جاتی، توقعات اور حقیقت کے درمیان فرق کا سبب بھی یہی ہے۔

آخر میں میں عالمی بنک کا حوالہ دوں گا جس نے نو آبادیاتی دور کے بعد کے ملکوں کی ترجیحات کا کم وبیش تعین کیا ہے۔ بینک اعلیٰ تعلیم میں سرمایہ کاری کا مخالف ہے اس کا نظریہ یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں کو اعلیٰ تعلیم کی ضرورت ہی نہیں۔ انہیں زیادہ سے زیادہ خواندگی کی ضرورت ہے ان کی پالیسی کی بنیاد یہ ہے کہ ہنرمند کارکنوں کی ایک کھیپ تیار ہو جائے ایسے لوگوں کی نہیں جو اپنے اوپر حکومت کر سکیں۔

پاکستان میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے تمام تعلیمی ادارے قومی ملکیت قرار دے دیئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیوروکریٹس، یونیورسٹیاں چلانے لگے پولیس افسر، یونیورسٹیوں کے بُرے سربراہ ثابت ہوئے، یہی بات فوج کے افسروں پر بھی صادق آتی ہے جنرل محمد ضیاء الحق نے بھی ذوالفقار علی بھٹو کی پیروی کی انہیں اپنے لئے ایک حلقہ انتخاب چاہیے تھا جو انہیں میسر نہیں تھا۔ انہیں کسی پارٹی کی تائید اور حمایت بھی درکار تھی جماعت اسلامی کے سوا کوئی جماعت ان کی حمایت کرنے کے لئے تیار نہیں تھی جماعت اسلامی نے اعلیٰ تعلیمی اداروں کی اسلامائزیشن کی قیمت رکھی۔ صدر ضیاء الحق کی مغرب کی حامی حکومت کے دور میں امہات المومنین کے اسماء نہ جاننے والا فزکس کا کوئی استاد تقرری کا اہل قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

خلدونیہ نام سے جو یونیورسٹی میں قائم کرنے کے لئے کوشاں ہوں اس کا مقصد تیسری دُنیا کے ایک ملک میں اعلیٰ تعلیم کا احیاء کرنا ہے۔ وہ اپنے طور پر اس کا احیاء نہیں کر سکتا۔ چند مثالیں قائم کر کے یہ دکھانا مقصود ہے کہ آزاد، اور اپنے اوپر انحصار کی بنیاد پر حکومت کرنے والے عوام کے لئے کس قسم کا نصاب تعلیم موزوں ہے، ماضی اور مستقبل کے مابین رابطے قائم کرنا، ورثے میں ملنے والی روایات اور دورِ حاضر کے مروجہ علم میں توافق اور مناسبت پیدا کرنا اس کا ہدف ہوگا۔

س: پاکستان کے اندر اور باہر اس منصوبے کے سلسلے میں آپ کے کون لوگ مددگار ہیں؟

ج: پاکستان کے باہر زیادہ تر نوجوان اہل علم ہیں جن کا تعلق تیسری دنیا سے ہے لیکن وہ یورپ یا امریکہ میں مقیم ہیں وہ تیسری دُنیا کا ایک مثالی تعلیمی ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں مجھے تربیت

MashalBooks.org

یافتہ نوجوانوں کے کم وبیش 150 خطوط موصول ہوئے ہیں انہوں نے لکھا کہ ہمیں انٹرنیٹ پر آپ کی کوششوں کے بارے میں علم ہوا ہے ''کرانیکل آف ہائر ایجوکیشن، میں بھی ہم نے پڑھا ہے، ہم مدد کر سکتے ہوں پڑھا سکتے ہوں تو ہمیں لکھئے۔ میں نے ابھی مغربی دنیا کے امدادی اداروں کی طرف رجوع نہیں کیا پاکستان میں جاگیرداروں سے بہت کم ہمدردی اور مدد ملی ہے۔

س: اس پر آپ کو حیرت تو نہیں ہوئی ہوگی۔(9)

ج: نہیں، بے نظیر بھٹو کی حکومت کے ہاورڈ اور آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے ارکان کی طرف سے میرے منصوبے کی سب سے زیادہ مخالفت ہوئی ہے۔ پنجاب اور خاص طور پر کراچی سے تعلق رکھنے والی تاجر برادری بہت مددگار ثابت ہوئی ہے۔

ہمارے ہاں کالج اور یونیورسٹیاں موجود ہیں جو جہلا کو لکھنا پڑھنا سکھا رہی ہیں بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں رکھنے والے ایم آئی ٹی یا ہاورڈ یا ایمہرسٹ کالج میں داخلے کا امتحان پاس نہیں کر سکتے۔ انہیں ٹیسٹ دیئے گئے لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ کاروباری ادارے کہتے ہیں کہ دیکھئے ہمارے پاس بھاری تعداد میں بی اے اور ایم اے پاس امیدوار ہیں لیکن انہیں ملازمت نہیں دی جا سکتی۔ ان کے پاس کوئی ہنر نہیں ان کے پاس علم نہیں۔ انہیں کسی کام کے لئے بھی تربیت نہیں دی گئی۔ پھر ایسے افراد کو ہم کیوں ملازمت دیں؟ ''عالمی بنک کا کہنا ہے'' دیکھئے آپ کے پاس کتنے بے روزگار گریجویٹس ہیں! ایسے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی کیا تک ہے۔ ان کی یہی منطق ہے۔

تاجر برادری میرے منصوبے کی اس لئے حمایت کرتی ہے کہ انہیں تربیت یافتہ افراد اور لیڈرشپ چاہیے۔ لیڈرشپ اعلیٰ لبرل آرٹس کی تعلیم سے حاصل ہوتی ہے۔

س: میرے خیال میں آپ نے مجوزہ یونیورسٹی کا نام عظیم عرب عالم ابن خلدون کے نام پر تجویز کیا ہے؟

ج: عبدالرحمٰن ابن خلدون چودھویں صدی کے بہت بڑے مورّخ اور عمرانیات کے عالم تھے وہ ایک سیکولر اور سائنٹیفک شخصیت تھے۔ غالباً تیونس میں پیدا ہوئے اسپین کے شہر سویل میں پرورش پائی دوسری جگہوں کے علاوہ سویل، غرناطہ اور مصر میں کام کرتے رہے انہوں نے دُنیائے اسلام کے دوسرے حصوں کا بھی سفر کیا، اس لحاظ سے وہ عالمگیر حیثیت کے حامل

تھے۔

میں نے مجوزہ یونیورسٹی کا نام اُن کے نام پر رکھنے کا فیصلہ اس بنا پر کیا کہ مجھے یقین ہے کہ مسلم عوام یا کہیں کے بھی عوام صنعتی دور سے پہلے کے روایتی کلچر اور معیشت سے جدید دور کے کلچر اور معیشت تک کا سفر اسی صورت میں کر سکتے ہیں کہ انہیں ان کے باہمی تعلق کا علم ہو اور جدیدیت اور ورثے میں ملنے والی روایات کے باہمی تعلق سے آشنا ہوں، میری دلیل یہ ہے کہ ہم اس وقت تک بنیاد پرستی کا مقابلہ نہیں کر سکتے جب تک عوام کا ایک جدید، ترقی پسند سیکولر تعلیم یافتہ طبقہ پیدا نہیں کر لیتے جو روایات کو جانتا ہو اور ان میں سے جو بہترین ہیں انہیں اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

فرانز فینن، میلکم ایکس، نوم چومسکی اور ایڈورڈ ڈبلیو سعید

س: آپ کا بعض نہایت شاندار شخصیات سے، جیسے الجزائر میں فرانز فینن سے خوش کُن معاملہ رہا ہوگا؟

ج: جب میں فینن سے ملا تو اس وقت تک وہ نہیں جانتے تھے کہ انہیں خون کا سرطان ہے بس اتنا کہتے تھے کہ ان کی صحت اچھی نہیں۔ چند مہینوں میں سرطان کی تشخیص ہوئی جس کے بعد وہ لکھنے لکھانے میں اس طرح مصروف ہو گئے جیسے وہ اپنی زندگی کے رس کی آخری بوندیں تک نچوڑ لینا چاہتے ہوں۔ ''ریچیڈ آف دی ارتھ'' بڑی تیزی سے لکھی گئی۔ الجزائر نے فینن کو کئی طریقوں سے مختلف قالبوں میں ڈھالا۔(10)

1960ء کے اواخر میں مجھے وقتاً فوقتاً فینن اور میلکم ایکس کی زندگیوں میں بعض مشابہتیں دکھائی دینے لگیں۔ طبقے اور تعلیمی پس منظر کے لحاظ سے دونوں کی شخصیتیں مختلف تھیں۔ فینن اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے میلکم ایکس نے تعلیم نہیں پائی تھی۔ مجھے لگا کہ دونوں نے سیاسی شعور، نسلی امتیازات کے حوالے سے حاصل کیا۔ یہ نسلی اور نسل پرستی کا شعور تھا جو انہیں ان معاشروں سے ملا یہ سفید فام لوگوں کا غلبہ تھا یہیں ان کی سیاسی تربیت ہوئی ان کی سیاست کا آغاز نسل پرستی کے خلاف ان کے غصے اور ردعمل سے ہوا جو علیحدگی کی حدود چھونے لگا تھا۔ دونوں پر اپنی جدوجہد کے ذریعے بنی نوع انسان کی عالمگیریت کا انکشاف ہوا، جدوجہد میں مصروف ہوئے تو نسل سے بلند ہوئے معاشرتی صداقتوں کا ادراک اور سیاسی جدوجہد نے انہیں منقلب کر دیا۔ دونوں باور کرنے لگے کہ معاشرت اور انسانی رویے کا تعین کرنے کا

MashalBooks.org

بنیادی معیار نسل نہیں بلکہ طبقہ ہے پایان کار دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ کچلے ہوئے عوام کا اشتراک اپنے آپ سے آشنا کرنے کا وسیلہ بنتا ہے اپنی طاقت اور انسانیت منکشف ہوتی ہے اگر آپ مزاحمت نہیں کرتے جدوجہد نہیں کرتے تو اپنا آپ بھی دریافت نہیں کر سکتے اپنی انسانیت تک بھی دریافت نہیں کر پاتے دوسروں کا تو مذکور ہی کیا۔

دونوں پر کھلا کہ طبقے اور طبقاتی تعلق معاشروں کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں فینن نے ''دی ریچڈ'' میں تشدد سے متعلق باب میں جو نکتہ بیان کیا ہے امریکہ اور یورپ کے تبصرہ نگاروں نے اسے نہیں سمجھا اس بنا پر انہوں نے اسے غلط رنگ دیا۔ اسے مسخ کر دیا انہوں نے اسے تشدد کی حمایت اور تعریف قرار دیا۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا اس میں صرف مزاحمت کی اہمیت بیان کی گئی اور اسے اپنی اور دوسروں کی انسانیت کی پہچان کا وسیلہ قرار دیا اور بتایا گیا تھا کہ اجتماعیت میں ہی انسان کی ذات کا بھرپور اظہار ہو پاتا ہے۔

فینن کے ایک پہلے کے مقالے ''مرتے ہوئے نوآبادیاتی نظام'' Dying Colonialism میں اس کا وضاحت کے ساتھ اظہار ہوا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح الجزائری خاتون جدوجہد میں شامل ہوئی تو اس نے رضا کارانہ طور پر نقاب ترک کر دیا اس طرح نقاب مزاحمت کی علامت بن گیا اور اس وقت تک رہا جب تک کہ مزاحمت منظم نہیں ہوگئی۔ روایت سے وابستہ رہ کر ہی الجزائر کے عوام فرانس اور اس کی ثقافتی اجارہ داری کو مسترد کر سکتے تھے۔(11)

الجزائر کی جہد آزادی سے پہلے اور بعد ریڈیو کے استعمال کے ضمن میں بھی انہوں نے ویسا ہی کیا اور بتایا کہ الجزائر کے عوام ریڈیو کو جابروں کا وسیلہ سمجھتے تھے لیکن جدوجہد میں شامل ہوئے تو ریڈیو کو تحریک آزادی کا ایک ہتھیار سمجھنے لگے۔ ٹیکنالوجی، سماجی رسوم، نوآبادیاتی نظام اور جبر کی ہر علامت سے تعلق جدوجہد میں شرکت کے بعد بدل جاتا ہے۔ فینن نے تشدد کے نکتے کی وضاحت کی ہے تشدد کرنے کی ترغیب نہیں دی میرے خیال میں انہیں غلط پیش کیا گیا ہے۔

ان کے آخری فکر انگیز خیالات ''ریچڈ'' کے اس باب میں دیکھے جا سکتے ہیں جس کا عنوان ''قومی شعور کے رخنے'' ہے۔ میں جب طلباء کو نوآبادیات کے بعد کی صورت حال پر پڑھا رہا ہوتا ہوں تو انہیں یہ بات پڑھنے کی تلقین کرتا ہوں، فینن نے نیشنلزم کے رخنوں اور

گمراہیوں کا بڑی وضاحت سے ذکر کیا ہے اور بتایا کہ وہ کس طرح کا ڈھانچہ پیدا کرتا ہے اور کس طرح دوسروں پر انحصار کرنے کے رجحان کو بڑھاتا ہے۔ نوآبادیات کے بعد کی صورتحال جو سامراجی غلبے اور تسلط کا نیا ہتھیار ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس نے یہ سب دیکھ لیا تھا اس نے یہ اس ابھرتی ہوئی نئے سامراج کی ساتھی اشرافیہ کی شکل میں دیکھ لیا تھا جسے وہ کہتا تھا یہ ہوائی جہازوں اور جیٹ جہازوں میں سفر کرنے والے مراعات یافتہ نوجوان تھے۔ فینن چالیس برس کی عمر میں وفات پا گئے کاش وہ زندہ رہتے۔

س: کیا آپ نے ان کے ساتھ مل کر کام کیا؟

ج: میں نے چھ مہینے ان کے بہت قریب رہ کر کام کیا وہ نیشنل لبریشن فرنٹ (قومی محاذ آزادی) کے دفتر اطلاعات کے سربراہ تھے اور اس کا اخبار ''المجاہد'' نکال رہے تھے۔

س: ان کی کتاب Black Skin White Mask کے بارے میں آپ کی کوئی رائے؟ (12)

ج: آپ Black Skin, White Masks لیں A Dying Colonialism پڑھیں یا Wretched of the Earth کا مطالعہ کریں یا وہ اداریے جو انہوں نے المجاہد کے لئے لکھے جو Toward the African Revolution کے عنوان سے کتابی شکل میں چھپے انہیں دیکھیں تو آپ فینن کو نسل سے طبقے کی طرف، تشدد سے تعمیر نو کی طرف، علم سے تخلیقی عمل کی طرف بڑھتے دیکھیں گے۔

Black Skin نسل پرستی کے خلاف غصے، ندامت، تذلیل، شخصیت اور انسانیت کی بے وقعتی جو کسی فرد کو برداشت کرنا پڑتی ہے کا مرقع ہے یہ لیپولڈ سنگور کی ابتدائی تصانیف میں اور ایمکائی کیبرال کی شکل میں ملے گا۔ یا میلکم ایکس کے تجربات اور قلب ماہیت کا مظہر دکھائی دے گا۔ مذہبی تجربہ بھی اس تبدیلی کا محرک ثابت ہوا۔ فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے مکہ کا سفر بھی اس تبدیلی کا سبب بنا۔ میں نے انہیں مکہ جاتے اور واپس آتے دیکھا وہ بہت بدل گئے تھے۔

س: میلکم کے بارے میں کہتے ہیں کہ حج کرنے کے بعد وہ تنگ نظر قوم پرستانہ موقف چھوڑنے اور عالمی نقطہ نظر اپنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ج: میلکم نے اسلام قبول کر لیا تھا اس نے دور غلامی سے شروع ہونے والی سفید فام نسل پرستی کے علمبرداروں کے ہاتھوں کالوں کو ظلم و ستم کا ہدف بننے کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اس کا ردِ عمل تھا

MashalBooks.org

کہ اسلام نے کالے گوروں کی ہر قسم کی تقسیم کو مسترد کر دیا ہے کالے مسلمانوں کی تنظیم ''نیشنل آف اسلام'' کہلاتی تھی یہ کالی نیشن تھی کالوں کی نیشن نہیں تھی یہ کالی علیحدگی کی تحریک تھی میلکم ایکس علیحدگی کا مبلغ تھا۔

یہ نظریاتی لحاظ سے صیہونیت کی طرح کی تھی۔ یہودی سمجھتے تھے کہ وہ اسی صورت میں محفوظ اور آسودہ ہوں گے کہ اپنے لئے علیحدہ یہودی ریاست قائم کریں۔ وہ فلسطین میں ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔نیشن آف اسلام کا بھی یہی نظریہ تھا۔

میلکم ایکس بڑا وسیع القلب انسان تھا مکہ جانے کے بعد اس پر کھلا کہ اسلام نسل پرستی کے خلاف ہے۔ دورانِ حج اس نے دیکھا کہ ترک، چینی، سکاٹس، ہر طرح کے لوگ گورے، کالے، زرد، بھورے، سب لوگ ایک جگہ جمع ہیں۔مل کر کھاتے ہیں ایک فرش پر رہتے ہیں ایک سا ہی لباس پہنتے ہیں۔ اس نے اسے ہلا کر رکھ دیا وہ بول اٹھے۔'' یہاں کوئی نسل نہیں یہ کیا ہو رہا ہے۔'' جب وہ حج سے واپس آیا تو اس نے کہا کہ میں نے ایک ایسا معاشرہ دیکھا ہے جہاں نسل کا تصور تک نہیں ایسا معاشرہ قائم کرنا ممکن ہے۔

جو بات وہ اچھی طرح سمجھ نہ سکا یہ تھی کہ ایک اور قسم کی تقسیم وہاں بھی موجود تھی وہ تقسیم تھی طبقوں کی۔ وہ حج کے مختصر سے وقفے میں نمایاں نہیں ہوتی تھی کیونکہ اس کے دوران کوئی، دوسرے سے یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ آیا وہ امیر ہے یا غریب۔ تاہم وہ لمحہ اس کے لئے بہت اہم تھا اسی کے سبب وہ زندگی گنوا بیٹھا۔

میں پرنسٹن میں پڑھتا تھا جب میری اس سے ملاقات ہوئی۔ پرنسٹن امریکہ میں گوروں کا پہلا ادارہ تھا جہاں میلکم نے تقریر کی میں نے اس کے انتظام میں مدد کی تھی۔

س: 1960ء کے عشرے کے وسط میں امریکہ میں جنگ مخالف تحریک میں جو دانشور سب سے نمایاں ہوئے وہ نوم چومسکی تھے؟

ج: 1960ء میں جب جنگ مخالف تحریک ابھی شروع ہو رہی تھی تو وہ جدید لسانیات میں اپنے کام کے حوالے سے ایک تاریخی حیثیت حاصل کر چکے تھے۔1967ء میں انہوں نے ''نیویارک ریویو آف بکس میں'' ''دانشوروں کی ذمہ داری'' (14) کے عنوان سے ایک مضمون لکھا یہ ایک بڑی عمدہ تحریر تھی جس میں انہوں نے کہا کہ سرد جنگ نے امریکہ میں دانشوروں کا ضمیر، ان کا علم اور تحقیق کی روایت تباہ کر دی ہے اور سوال اور اختلاف کرنے کی

MashalBooks.org

لازمی روایت کو مٹا ڈالا ہے۔ یہ امریکہ کی دانشورانہ اور ثقافتی زندگی پر اور ان دانشوروں کے خلاف فرد جرم تھی جو اس کے اسیر ہوئے۔ اس مضمون کا گہرا اثر ہوا یہ بہت ہی طاقتور اثر تھا۔

چنانچہ اس وقت، میں ان سے سرگرم عمل دانشور کی حیثیت سے واقف ہوا۔ سرد جنگ کے عرصے کے دوران دو مضامین کا تحریک پر گہرا اثر ہوا ان میں سے ایک چومسکی کا مضمون ''دانشوروں کی ذمہ داری'' تھا اور دوسرا مضمون میرا تھا یہ 1965ء میں دی نیشن میں چھپا جس کا عنوان تھا کہ ''کیسے بتایا جاسکے گا باغی کب جیت گئے ہیں؟''۔ یعنی How to tell when rebels have won.(15) میں نے اس مضمون میں لکھا کہ امریکہ ویت نام میں جنگ ہار گیا ہے اور اس نقطے سے آگے وہ یہی کرسکتا ہے کہ وہ لوگوں کو مارے لیکن وہ جتنا کچھ بھی مارے گا اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس مضمون کا اچھا اثر ہوا۔ سینٹر فل برائٹ اور سینٹر فرنیک چرچ نے ویت نام کے بارے میں سینٹ کی سماعت کے دوران یہ مضمون استعمال کیا۔

سو اس طرح مجھے نوم کے بارے میں واقفیت ہوئی۔ آپ سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے یاد نہیں آرہا کہ میں اُن سے کب ملا میری ان سے ملاقات اس طرح ہوئی جس طرح کسی کی ہوا یا بارش سے ہوتی ہے۔ بس یوں جانئے کہ ملاقات ہوگئی۔ میں اسے اپنی زندگی کا ایک ایسا واقعہ کہوں گا جس کا ہونا یاد نہیں۔ فینن سے ملاقات ایسی قدرتی نہیں تھی میں چاہوں تو ملاقات کا وقت تک یاد کرسکتا ہوں۔

دونوں کی ملاقات سے پہلے چومسکی اور میں دانشوروں کے ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جو جنگ کے مخالف تھے۔ ہمارے درمیان آدھی درجن یا اس سے زیادہ بار ٹیلی فون پر بات چیت ہوئی ہوگی۔

دسمبر 1970ء میں ہنری کیسنجر کو اغوا کرنے کے الزام میں گرفتاری کے بعد میں کچھ عرصہ جیل میں رہا پھر ضمانت پر باہر آیا۔ نوم چومسکی دوسرے شخص تھے جو مجھ سے ملنے بذریعہ جہاز شکاگو پہنچے۔ وہ لکڑی کے فرش والے بے ساز وسامان گھر میں میرے ساتھ ٹھہرے اور انہوں نے اپنی بے آرامی کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ہم نے بہت باتیں کیں پہلے شخص جو مجھے ملنے آئے وہ پرنسٹن کے رچرڈ فاک تھے وہ مجھے اچھی طرح نہیں جانتے تھے، البتہ ہم دونوں

MashalBooks.org

میں جنگ کی مخالفت قدر مشترک تھی۔

بعد میں اور وہ بہت اچھے دوست بن گئے لیکن ہماری زندگی کچھ اس طرح منضبط ہے کہ بہت زیادہ ملاقاتیں نہ ہوسکیں لیکن کبھی کبھار ملاقات ہوتی رہی۔

س: چومسکی کو آج امریکہ میں اظہار اختلاف کے باب میں منفرد حیثیت حاصل ہے آپ کے خیال میں ان کی آواز (ذرائع ابلاغ میں نہ سہی) پھر بھی بلند تر ہوتی جارہی ہے زیادہ سے زیادہ لوگ ان کی کتابیں پڑھتے اور ان کے لیکچر سننے آنے لگے ہیں۔

ج: اس کی تین وجوہ ہیں۔ ثابت قدمی، تسلسل اور آزادی۔ چومسکی کبھی دھیمے نہیں پڑے اُنہوں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ایک بار جب انہوں نے وحشی یعنی سامراج کو پہچان لیا تو اس کا تعاقب کیا خواہ وہ کسی شکل میں بھی تھا۔ آیا وہ میڈیا کی شکل میں تھا، فوجی طاقت کی صورت میں تھا، مداخلت کار تھا گلوبلائزیشن کی شکل میں۔ ان میں استقامت ہے۔ ان کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے وہ کبھی اس طرح کے نعروں سے مرعوب اور متاثر نہیں ہوئے کہ ''کلنٹن بہتر کام کریں گے'' یا نکسن بُرے تھے لیکن کارٹر نے اپنے دورِ صدارت میں انسانی حقوق کی کچھ پاسداری کی'' ان کے کام میں طریق کار، انداز، اور مطمح نظر میں تسلسل ہے۔ تاہم تسلسل کا مطلب اعادہ کرتے چلا جانا بھی ہے۔ گذشتہ بیس برس کے دوران چومسکی نے اپنے آپ کو کئی بار دہرایا ہے البتہ لسانیات کے معاملے میں انہوں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔

وہ بہت سے لوگوں کو پڑھا رہے ہیں میں ابھی تک ان سے اُن کی یہ طاقت ور بات نہیں سیکھ سکا کہ سچ کو بار بار دہرایا جانا چاہیے۔ سچ ایک بار کہہ دینے سے فرسودہ نہیں ہوجاتا اس لئے اسے دوہراتے رہنا چاہیے یہ نہ سوچیں کہ کس نے اسے سُنا اور کس نے نہیں سُنا، وہ جانتے ہیں کہ ذرائع ابلاغ اور طاقت کے دوسرے ادارے اس درجہ طاقتور ہیں کہ ایک بار سچ کہنا کافی نہیں آپ کو ایک نکتہ سمجھانے کے لئے مختلف حقائق دوہراتے رہنا چاہیے۔

آپ مجھے معاف کریں اگر میں یہ کہوں اور شاید چومسکی بھی اسے پسند نہیں کریں گے کیونکہ وہ سیکولر شخص ہیں۔ ان کی دوہرانے کی طاقت صوفیوں کے وظیفہ پڑھنے جیسی ہے۔ صوفیوں کا قاعدہ ہے کہ جب ان پر کوئی اصول کھل جاتا ہے تو وہ اسے دوہراتے اور اس کا ورد کرتے رہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ صوفیا کا روحانی اصول ہے اور چومسکی کا سیکولر اصول ہے

صوفیانہ نجات کے طالب ہوتے ہیں اور چومسکی آزادی کے جویا ان میں دوہرانے اور تکرار کرنے کی طاقت غیرمعمولی ہوتی ہے۔ تیسری صفت ہے آزادی۔ چومسکی ٹراٹسکی کو ماننے والوں میں سے نہیں ہیں وہ لینن یا ماؤ کو ماننے والے ہیں وہ انارکسٹ ہیں لیکن ہیں انسان دوست، ان کے نزدیک چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے والی طاقت سے بدی پیدا ہوتی ہے۔

س: ایڈورڈ سعید دوسرے شخص ہیں جن سے آپ کی برسوں کی راہ ورسم رہی ہے آپ اُن سے پہلے کب ملے؟

ج: 1968ء کے اوائل میں ابراہیم ابولغود نے عرب افیرز کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ اس رسالے کے ایک مضمون نے جو غیرمعمولی طور پر اچھا تھا مجھے بہت متاثر کیا۔ یہ ایڈورڈ سعید کا لکھا ہوا تھا "The Arab Portrayed" اس کا عنوان تھا۔(16) اس میں 1967ء کی عرب اسرائیلی جنگ کے، عرب بحیثیت فرد اور عرب بحیثیت اجتماع پر مرتب ہونے والے اثرات کے اخباری اور سیاسی تجزیوں کا سیر حاصل محاکمہ کیا گیا تھا انہوں نے اس کا رشتہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہونے والے یہودی مخالف مباحث سے جوڑا اور نتیجہ اخذ کیا کہ عرب اور خاص طور پر فلسطینی باشندے یہودیوں کا سایہ بن گئے ہیں یعنی جو کچھ یہودیوں پر گزرتی رہی عرب اور فلسطینیوں پر بھی وہی کچھ بیت رہی ہے۔

میں نے ابراہیم ابولغود سے پوچھا ''یہ کون صاحب ہیں'' انہوں نے بتایا کہ یہ نوجوان ہیں بس تمہاری عمر کے ہوں گے۔ کولمبیا یونیورسٹی میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کی ان سے ملاقات ہو تو انہیں بتایئے کہ میں نے ان کا مضمون پڑھا ہے اور اسے بہت پسند کیا ہے۔ 1968ء میں ہماری ملاقات ہوئی۔ آپ نے ایڈورڈ سعید سے انٹرویوز کی جو کتاب مرتب کی ہے اس کے دیباچے میں میں نے اس ملاقات کا ذکر کیا ہے۔(17)

فلسطین کا مسئلہ

س: یہ بڑی چہل پہل اور سرگرمیوں کا زمانہ تھا؟

ج: فلسطین کی تنظیم آزادی (پی ایل او) کے قیام کے فوراً بعد امریکہ میں رہنے والے عربوں نے ایک اجلاس بلایا پی ایل او نے لبنان میں کرامہ کے مقام پر واقع مہاجر کیمپ پر اسرائیلی حملے کو پسپا کر دیا تھا یہ چھوٹے سے میدان میں ایک چھوٹی سی فتح تھی لیکن عربوں اور فلسطینیوں کے لئے اس کی بڑی معنویت تھی کیونکہ یہ فتح 1967ء میں پیش آنے والی غیر

MashalBooks.org

معمولی شکست کے بعد نصیب ہوئی تھی۔ فلسطینی عوام نے پی ایل او سے مسلح تحریک آزادی کے طور پر بڑی اُمیدیں وابستہ کرلیں۔ اس سال ویت نام کی جنگ اپنے عروج پر پہنچی، مسلح جدوجہد کو تیسری دنیا اور دنیا بھر کے بائیں بازو کے حلقوں میں بڑی کشش اور مقبولیت حاصل ہوگئی۔

بعض عرب طلباء نے مجھے کانفرنس میں بنیادی لیکچر دینے کی دعوت دی۔ پی ایل او کے بعض لیڈر بھی وہاں موجود تھے۔ میں نے یہ موقف اختیار کیا کہ مسلح جدوجہد فلسطینی حالت سے قطعاً لگا نہیں کھاتی اس لئے اس پر زور دینا غلط ہے۔ میں نے کہا کہ مسلح جدوجہد کا تعلق اسلحہ سے زیادہ تنظیم سے ہے۔ کامیاب مسلح جدوجہد مخالف کو تنظیمی لحاظ سے پیچھے چھوڑنے کا وسیلہ ہوتی ہے اسے جنگ میں شکست دینے کا نہیں۔ دشمن کو انتظامی لحاظ سے پچھاڑنے کا مطلب اس کے قانونی اور اخلاقی جواز کو ختم کرنا ہے۔ مخالف کو تنظیمی نقطۂ نظر سے پھسڈی ثابت کرنے کے لئے اس کے بنیادی تضادات کو نمایاں کرنا اور انہیں دنیا پر اور سب سے بڑھ کر مخالف ملک کے عوام پر عیاں کرنا ضروری ہے۔

میری دلیل یہ تھی کہ اسرائیل کا اساسی تضاد یہ ہے کہ اس کی بنیاد مصیبت زدہ انسانیت کی علامت کے طور پر ڈالی گئی تھی لیکن ایسے لوگوں کی قیمت پر جن کا کوئی جرم نہیں تھا اس تضاد کو ابھارنا اور نمایاں کرنا ہوگا۔ یہ مقصد مسلح جدوجہد کے ذریعے حاصل نہیں کیا جاسکتا دراصل آپ مسلح جدوجہد کے ذریعے ایسا نہیں کرسکتے بلکہ مسلح جدوجہد کے ذریعے متذکرہ تضاد کو دبا دیتے ہیں اسرائیلی سیہونی تنظیمیں مسلسل اس پراپیگنڈے میں مصروف ہیں کہ یہودی عرب تشدد کا شکار ہیں۔

س: آپ نے اس کانفرنس میں جو بات ذہن نشین کرانا چاہی کیا وہ الجزائر میں حاصل ہونے والے تجربے کی روشنی میں کی گئی تھی؟ الجزائر میں انقلابی جدوجہد کے دوران دس لاکھ الجزائری مارے گئے تھے۔

ج: ہاں، بالکل، اسی حوالے سے اگر میں الجزائر کے تجربے سے نہ گزرتا تو میں اس نتیجے میں نہ پہنچ سکتا۔ میں نے الجزائر میں جو کچھ دیکھا اس کے بعد میرے لئے مسلح جدوجہد کو رومانوی رنگ دینا ممکن نہیں تھا۔ الجزائر کے عوام کو بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ یہ قیمت ادا کرنے پر راضی تھے لیکن یہ بہت زیادہ تھی۔ میں جو جانتا تھا بہت سے لوگ اسے

آج بھی ماننے کے لئے تیار نہیں کہ الجزائریوں نے فوجی اعتبار سے جنگ ہار دی تھی لیکن سیاسی طور پر جیت گئے تھے وہ فرانس کو اخلاقی اعتبار سے تنہا کرنے میں کامیاب رہے چنانچہ انقلابی جدوجہد کا بنیادی کام مخالف کو اخلاقی لحاظ سے تنہا کرنا ہے، اس کی اپنی آنکھوں میں اور دنیا کی نظروں میں۔

مثال کے طور پر میں نے 1968ء میں کہا تھا کہ ''اب وقت ہے کہ ہم قبرص میں اپنے جہاز اور لبنان میں اپنی کشتیاں کھڑی کر دیں اور کہیں کہ ہم اسرائیل کو تباہ نہیں کرنا چاہتے یہ ہمارا ارادہ اور مقصد نہیں ہم صرف اپنے گھر واپس جانا چاہتے ہیں۔ خروج کی علامتوں کو اُلٹا دیں، دیکھیں کہ اسرائیلی چند جہاز ڈبونے پر آمادہ ہیں اور شاید وہ ایسا کریں بھی، انہیں ایسا کرنے دیں، ہم میں سے کچھ لوگ مارے جائیں گے مرنے دیں۔'' جب میں نے لیکچر ختم کیا تو نوجوان عرب طلباء میں خاصی بے چینی دیکھی انہیں صدمہ پہنچا تھا کہ گوریلا جنگ کا ماہر الجزائر سے آنے والا شخص، ویت نام جنگ کا مخالف لیڈر ان کی سوچ کے برعکس باتیں کر رہا ہے وہ بڑے فراخ دل تھے کسی نے مجھے ہوٹ نہیں کیا اور نہ کوئی نعرہ لگایا لیکن ان کے رویے میں سرد مہری نمایاں تھی۔ ایک شخص میرے پاس آیا اور کہا ''میں ایڈورڈ سعید ہوں۔ آپ نے جو کچھ کہا میں اس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں'' میں اس کے مضمون کے حوالے سے جانتا تھا کہ میں ایک ایسے فرد سے مل رہا ہوں جو تازہ اور نیا تخلیقی ذہن رکھتا ہے۔ تب سے ہم گہرے دوست چلے آ رہے ہیں۔

س: اب ذرا پیچھے چلتے ہیں اور ایک لمحے کے لئے دوسرے خطوط پر سوچتے ہیں آپ نے کہا کہ آپ نے 1965ء میں ''دی نیشن'' کے لئے ایک مضمون لکھا تھا آپ اس وقت نوجوان تھے آپ ہندوستان میں پیدا ہوئے ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ امریکہ میں تعلیم پائی الجزائر گئے اور اس طرح ہر مسائل پر امریکی سامعین سے گفتگو کرتے رہے کیا آپ کو کبھی اپنی بات کہتے ہوئے تکلف ہوا؟

ج: میں کبھی ہچکچایا نہیں میں نے محسوس کیا کہ نسل پرستی ایک عالمی مسئلہ ہے اور نسل پرستی کے خلاف لڑنا ایک عالمی چیلنج ہے۔ 1964ء یا 1965ء میں استادوں اور طلبا کی ایک چھوٹی سی میٹنگ تھی۔ ٹونکن گلف سے متعلق قرارداد منظور ہو چکی تھی ویت نامیوں نے پیکو میں امریکی اڈے پر حملہ کر دیا تھا شمالی ویت نام پر بمباری کا آغاز ہو چکا تھا ویت نام میں جنگ پھیلنے

لگے تھی۔

ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اس پر غور و بحث کا سلسلہ چل نکلا ہم شہری حقوق کی تحریکوں میں دھرنا دینے کی روایت پر کاربند رہتے آئے تھے، ایک ایسے دور سے گزر رہے تھے جہاں سرد جنگ سے متعلق مفروضوں اور مقاصد کا تال میل جاری تھا ہم نے سوچا کہ پڑھاتے رہنا ہی صحیح قدم ہے سچ کہنا ہی اصل میں مزاحمتی اقدام ہوگا۔

اسی دوران ایف بی آئی کے دو آدمی میرے پاس آئے انہوں نے اپنے شناختی کارڈ دکھائے۔ ایک نے پوچھا کہ کیا میں امریکہ کا شہری ہوں؟ میرا جواب نہیں میں تھا انہوں نے کہا کہ کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ بحیثیت مہمان آپ کو میزبان ملک کی حکومت پر نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیے؟ میں نے کہا کہ میں نے آپ کا نقطہ نظر سُن اور سمجھ لیا ہے میں آپ کو اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ میں امریکہ کا شہری تو نہیں ہوں لیکن میں ٹیکس ادا کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ امریکی جمہوریت کا یہ بنیادی اصول ہے کہ نمائندگی کے بغیر ٹیکس بھی نہیں ہوتا۔ جنگ کے سلسلے میں میری نمائندگی نہیں ہوئی، میرے عوام، ایشیائی عوام پر اس وقت بم برسائے جا رہے ہیں'' حیرت کی بات ہے کہ ایف بی آئی کے ایجنٹ اس سے سخت متاثر ہوئے۔ میری دلیل سن کر اُن کے چہرے سرخ ہو گئے۔ لگتا تھا جیسے ان کی زبانیں گنگ ہو گئی ہوں۔ تب مجھے امریکی روشن خیال اور اپنی لفاظی اور چالوں میں ایک گونہ توافق نظر آیا۔

س: اس بات کو آگے بڑھاتے ہیں جو آپ نے 1968ء کی کانفرنس میں عرب امریکیوں سے کہی کہ آزادی کی تحریکوں کو کامیاب بنانے کے لئے مخالفوں کو اخلاقی اعتبار سے تنہا کرنا ضروری ہے۔ میرے نزدیک اس کے لئے مخالفوں کا زبانی کلامی ہی سہی لبرل جمہوری روایات کا پاسدار ہونا لازم ہے۔

ج: ظاہر ہے کہ آپ ہٹلر اور سٹالن کی حکومتوں کو اخلاقی طور پر تنہا نہیں کر سکتے۔ اخلاقی تنہائی کا حربہ اسی صورت میں کارگر ثابت ہو سکتا ہے کہ مخالف نے اپنا جواز اخلاقی بنیادوں پر قائم کر رکھا ہو، گاندھی برطانوی نو آبادیاتی نظام کے تعلق میں اس تضاد کو اچھی طرح سمجھتے تھے یہ نظام لبرل اصولوں پر کاربند ہونے کا دعویدار بھی تھا اور ان کی خلاف ورزی بھی کر رہا تھا گاندھی نے برطانوی سامراج کو سر کے بل اُلٹا کھڑا کر دیا تھا۔

اسرائیلی سوسائٹی کو1967ء سے لے کراب تک عرصے میں بعض لوگوں کو ناراض کرنے کی قیمت چکانا پڑی۔ لیکوڈ دائیں بازو کی پارٹی ہے اس کے چند ہی منفی اخلاقی اصول ہیں اب یہ بہت بڑی پارٹی بن چکی ہے۔ اس نے آبادکاروں کی دائیں بازو کی تحریکیں منظّم کر لی ہیں۔ وہ اخلاقی دلائل سے کم ہی متاثر ہوتی ہیں۔ صیہونیت کا بنیادی تضاد یہ ہے کہ اس نے اپنے جواز میں جو اصول وضع کئے وہ تو اخلاقی تھے لیکن ان پر عمل درآمد کا طریقہ غیر اخلاقی تھا۔ اس کی اسی خامی سے فائدہ اُٹھایا جانا چاہیے تھا۔ 1970ء کی دہائی میں جب پی ایل او نے لبنان میں نیم ریاستی کردار اختیار کر لیا تھا تو کئی مواقع پیدا ہوئے لیکن گنوا دیئے گئے اب ایک موقعہ پیدا ہوا ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے والا کوئی نہیں۔

مثال کے طور پر مصر اور اردن کی حکومتوں نے اسرائیل سے امن قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، پی ایل او کی قیامت نے بھی اسرائیل سے امن قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے، معاہدہ امن کی شرائط اوسلو کے معاہدے میں بیان کی گئی ہیں یہ معاہدہ انتہائی غیر منصفانہ ہے کیونکہ اس میں اختلاف کے کسی ایک بنیادی مسئلے کا حل پیش نہیں کیا گیا۔ اس میں نہ معاوضہ طے کیا گیا ہے اور نہ فلسطین کی آدھی آبادی کی واپسی کی ضمانت دی گئی ہے جو مہاجرت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اس میں مقبوضہ علاقوں میں پانی سے متعلق حقوق کا بھی فیصلہ نہیں کیا گیا۔ اس میں فلسطینیوں پر حق خود ارادیت کا بھی ذکر نہیں۔ اس میں فلسطینیوں کے لئے بڑھتی اور پھیلتی ہوئی اسرائیلی نوآبادیوں سے کوئی تحفظ نہیں کیا گیا اس میں بیت المقدس پر قبضے کا بھی کوئی حل پیش نہیں کیا گیا۔ بیت المقدس مسلمانوں اور عیسائیوں اور یہودیوں کے لئے مساوی طور پر تقدّس کا حامل ہے اوسلو کے معاہدے میں وہ تمام بنیادی مسائل جوں کے توں رہنے دیئے گئے ہیں جو عرب اسرائیل کشمکش کا سبب ہیں۔

اس میں بس یہ کہا گیا ہے کہ اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان جنگ نہیں ہوگی وہ ایک دوسرے سے رابطہ رکھیں گے اور باہمی مسائل پُر امن پر حل کریں گے۔ اس صورتحال میں اسرائیلی حکومت اپنی آبادیوں کو وسعت دے کر بیت المقدس کے گرد گھیرا تنگ کر کے مشرقی بیت المقدس میں یہودی آبادیاں تعمیر کر کے مغربی کنارے اور غزہ میں اپنی فوجیں رکھ کر اوسلو کی رہی سہی روح کو بھی پامال کرنے میں مصروف ہے۔ فلسطینی تحریک کا واحد حاصل، اگر اسے حاصل کہا جاسکتا ہے تو یہ ہے کہ فلسطینی قیادت مقبوضہ علاقوں میں واپس آ گئی ہے۔

اگر یاسر عرفات گاندھی کا طریقہ اپنائیں یا مارٹن لوتھر کنگ کی پیروی کریں اور کل اعلان کر دیں کہ میں یہودی آبادیاں بسانے کو روکوں گا کیونکہ یہ اوسلو کی روح کی خلاف ورزی ہے ہم امن چاہتے ہیں ہمارا یہ عہد ہے لیکن تم جنگ کر رہے ہو ہم تمہارے خلاف تشدد کا سہارا نہیں لیں گے، ہم وسیع پیمانے پر تحریک شروع کریں گے کیونکہ اسرائیلی پتھروں کے مقابلے میں گولیاں برسائیں گے وہ بچوں کے خلاف سپاہی استعمال کریں گے ہم انہیں ایسا کوئی موقعہ نہیں دیں گے۔ اس طرح وہ تقسیم ہو جائیں گے ان کی سوسائٹی بٹ جائے گی۔ جس طرح امریکہ بٹ گیا تھا وہ کہیں کہ ہم اسے اس وقت تک منقسم رکھیں گے جب تک وہ قیام امن پر تیار نہیں ہو جاتا۔

فلسطینی جدوجہد کیسی ہونی چاہیے؟ اس ضمن میں میں نے جو کچھ کہا ہے اس کی اصابت ظاہر ہو چکی ہے۔ لیکن جب آپ کے پاس قیادت نہ ہو تو آپ کیا کر سکتے ہیں۔ میں نے یاسر عرفات سے پانچ چھ مرتبہ ملاقات کی ہے اور ان خطوط پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے یاسر عرفات نوٹ لیتے رہے اور وعدہ بھی کرتے رہے کہ وہ میری باتوں پر عمل کریں گے لیکن انہوں نے عمل نہیں کیا۔

س: یہ ایک طرح کا لینن والا درجاتی نمونہ ہے جو اوپر سے نیچے کی طرف آتا ہے۔

ج: جی، اسے درجاتی نظام کہہ لیں لینن والا ہرگز نہیں۔ جب ہم لینن ازم کا نقطہ استعمال کرتے ہیں تو پھر ڈسپلن، کفایت اور سادگی اور حقیقی قربانی کا تصور بھی ذہن میں اُبھرتا ہے۔ پی ایل او نے مسلح جدوجہد کا نعرہ تو اپنایا لیکن صرف اس خیال سے کہ اس میں اسلحہ استعمال ہوتا ہے۔ انہوں نے سیاسی تنظیم یا مادی سلسلہ واقتدار کے نعروں کا سہارا محض اس لئے لیا کہ وہ اختیارات تقسیم کر سکیں یہ ایک روایتی عرب سیاسی تنظیم ہے جس پر سیاسی لیڈروں کا کنٹرول ہوتا ہے جو بندوق کے سہارے اپنے جائز ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں لیکن جیسے ہی مقصد ختم ہو جاتا ہے ان کی بندوقیں بھی رک جاتی ہیں۔

س: آپ نے نیویارک میں نوم چومسکی ایڈورڈ سعید اور پی ایل او کے عہدیداروں سے ملاقات کی تھی؟

ج: 1975ء سے 1976ء تک پی ایل او کے کئی لیڈر، جن میں عرفات شامل نہیں تھے، اقوام متحدہ کے اجلاس کے سلسلے میں نیویارک میں تھے۔ ابراہیم ابولغو، ایڈورڈ سعید اور اقوام متحدہ میں

پی ایل او کے وفد نے مجھ سے اور چومسکی سے ملاقات کی اور پوچھا کہ آیا ہم ان کے لیڈروں سے ملنا پسند کریں گے؟ میں اور ایڈورڈ دونوں ان سے ملنے گئے اور تحریک پر اپنا ناقدانہ جائزہ پیش کیا اور مسلح جدوجہد میں ان کی مصروفیات اور امریکہ کی سول سوسائٹی کی ہمدردی حاصل کرنے میں ناکامی کے مضمرات پر اظہار خیال کیا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ امریکہ ایک نہایت پیچیدہ سوسائٹی ہے اور اس میں اثر ورسوخ پیدا کرنے کے کئی طریقے اور راستے ہیں۔ ہم نے اس سوسائٹی کے سیاسی عناصر کا ذکر کیا جو اسرائیلیوں سے ربط ضبط رکھتے ہیں ان میں وہ اسرائیلی دانشور شامل ہیں جو سوالات بھی کرتے ہیں اور شکوک وشبہات کا اظہار بھی۔ ہم نے امریکہ میں یہودی کمیونٹی کی قیادت سے مذاکرات کرنے اور امریکی سوسائٹی کے مختلف حلقوں تک رسائی حاصل کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے لئے لازم تھا کہ پی ایل او کی لیڈرشپ کے ہیڈکوارٹر سے جاری ہونے والے بیانات لہجے اور عمومی رویے میں مناسب تبدیلی لائی جائے۔

انہوں نے ہماری باتیں غور سے سنیں ایک آدمی تھا شفیق الحوث جس نے ہماری باتیں سمجھیں بھی اور ان سے اتفاق بھی کیا باقی اصحاب نے اپنی اپنی پوزیشن کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی بعض نے لیکچر دیئے۔ جن سے ظاہر تھا کہ ان کا حقائق سے کوئی واسطہ نہیں۔ چومسکی اس ملاقات سے سخت بددل ہوئے لیکن میں اس وقت تک نا اُمید نہیں ہوا تھا۔ میں نے بہت کچھ دیکھا تھا۔ انہوں نے اسرائیلیوں سے زیادہ خود اپنے آپ کو شکست دی تھی۔

س: 1970ء کی دہائی کے اواخر میں ایڈورڈ سعید نے فلسطین نیشنل کونسل میں شمولیت اختیار کی۔ اس کونسل کو جلاوطنی میں فلسطینی پارلیمنٹ کا درجہ حاصل تھا۔ کیا ایڈورڈ نے وہاں اپنے خدشات اور تنقید کا کھل کر اظہار کرنا شروع کر دیا تھا؟

ج: ہاں، ایڈورڈ، جو بالعموم خاموش رہا کرتے تھے پی ایل او کی حکمت عملی، طریقوں اور سیاسیات پر برسرعام تنقید کرنے لگے تھے۔ 1979ء میں چھپنے والے مقالے "The Question of Palestine" میں انہوں نے اس کا اظہار کیا۔ (8) انہوں نے فلسطینی جدوجہد میں تشدد کے استعمال پر اعتراض کیا۔ میرے خیال میں اس وقت ایسا کرنا بڑا جرأت مندانہ کام تھا۔ سعید، ابولغو اور شفیق الحوت کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ میں عرفات اور دوسرے لیڈروں سے ملتا رہوں اس لئے کہ میں کھری بات منہ پر کہنے کا عادی تھا۔ مشرق

وسطیٰ میں خاص طور پر نوجوانوں اور دانشوروں میں میری یہ شہرت تھی کہ میں غیر اصولی مصلحت نہیں کیا کرتا۔ ان کے نزدیک میرا استحکام ذات شک وشبہ سے بالا تھا۔ وہ مجھے تین چار مرتبہ عرفات سے ملانے لے گئے میں نے ہر بار کھل کر بات کی اور ہر مرتبہ ایڈورڈ نے میری تائید کی۔ ہماری آخری ملاقات تونس میں ہوئی تھی۔

1980ء میں، میں نے جنوبی لبنان کا دوسری بار دورہ کیا، یہاں پی ایل او کی فوجیں جمع تھیں، اسرائیلیوں نے1978ء میں جنوبی لبنان پر حملہ کیا تھا، میں دیکھ رہا تھا کہ وہ دوسری بار بھی حملہ کریں گے یہاں پی ایل او کی فوج کا اجتماع مخالفوں کی منظّم فوج کو حملہ پر اکساتا تھا میں نے عرفات کو لکھا کہ آپ نے جس طرح تنظیم کی ہے اسے دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ پانچ دن سے زیادہ مزاحمت نہیں کر سکیں گے۔1982ء میں حملہ ہوا یہ میرے لئے حیرت کا موجب نہیں تھا۔

پی ایل او کو لبنان سے نکال باہر کیا گیا تو میں، ایڈورڈ اور ابوالغود کے ساتھ یاسر عرفات سے ملنے گیا پی ایل او کو سخت مار پڑی تھی۔ اور وہ نکل کر تونس چلی گئی تھی عرفات بددل اور مایوس ہو گئے۔ اس دفعہ وہ میری باتوں پر دل جمعی سے غور کرنے کے قابل نہیں تھے، انہوں نے نوٹ لینے کا تکلف بھی نہیں کیا۔ حالانکہ اس سے پہلے جب بھی اُن سے ملاقات ہوئی وہ میری باتوں کے اہم نکات لکھتے جاتے تھے، اب مسلح جدوجہد چھوڑ دینے اور حربے تبدیل کرنے کی تکرار کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس کا وقت نکل چکا تھا وہ حربے اور جنگ کے ضابطے تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔ بہرحال انہوں نے مسلح جدوجہد ترک کر دی تھی اس موقعہ پر میں نے عرفات سے کہا کہ ان کی واحد بڑی ضرورت یہ ہے کہ اپنی صحیح اور صاف پوزیشن اختیار کریں تاکہ اسرائیلی ریاست کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا سوال نہ رہے۔ اعلان کر دیجئے کہ اسرائیلی ریاست تسلیم کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن یہ پوچھئے کہ آپ کس اسرائیل کو تسلیم کرنے کا کہتے ہیں، کیا یہ1948ء کا اسرائیل ہے؟ کیا یہ1947ء کے تقسیم کا منصوبے کے وقت کا اسرائیل ہے؟ کیا یہ1967ء کی جنگ کے عرصے کا اسرائیل ہے؟ کیا یہ اسرائیلی تصور کا اسرائیل ہے؟ کیونکہ اسرائیل اقوام متحدہ کا واحد ملک ہے، جس نے اپنی سرحدیں متعین نہیں کیں اور ان کا اعلان نہیں کیا۔

میں نے کہا کہ بتایئے آپ کی سرحدیں کہاں ہیں؟ آیئے سرحدوں کے بارے میں گفت

وشنید کرلیں، آپ کے نزدیک فلسطین کی کم سے کم سرحدیں کیا ہونی چاہیں؟ انہیں طے کرلیں۔ یہی ہم چاہتے ہیں قابلِ عمل اور قابلِ قبول امن تجویز پیش کریں جسے شاید کٹر صیہونی تسلیم نہ کریں لیکن دنیا اور مہذب اسرائیلی رائے عامہ جسے مسترد نہ کرسکے ایک ایسی سرحد جو اسرائیل کو سلامتی مہیا کرتی ہو اور جس کا وہ برسرعام مطالبہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جو فلسطینیوں کے لئے انصاف کی ضامن ہو اور کوئی بھی اس کی مقبولیت سے اختلاف نہ کرسکے۔

میں نے ان سے کہا کہ وہ پانچ یا چھ نکات کی ایسی تجویز مرتب کریں اور اس کو اپنی جدوجہد کا محور ٹھہرائیں، اس پر لڑیں حکومتوں کو اس پر متفق کریں یہی تجویز لے کر اقوام متحدہ میں جائیں امریکی کانگرس کے پاس لے جائیں ایک طویل عرصے تک آپ کے سامنے ایک دیوار کھڑی رہے گی لیکن آپ فلسطینی عوام کے حقوق کا جواز قائم کرلیں گے اور اس کا جائز ہونا ثابت کردیں گے بالآخر اسرائیلی آپ سے مذاکرات کرنے کے لئے آمادہ ہوجائیں گے اور آپ کے ساتھ میز پر آبیٹھیں گے۔

ہماری گفتگو ختم ہوئی اور ہم باہر نکلے تو ایڈورڈ کا رنگ اڑا ہوا تھا وہ کاغذ کی طرح سفید تھے۔ وہ ناراض اور مایوس تھے وہ نفی میں سرہلا رہے تھے۔ ایک فلسطینی، بینکر جو ہمارے ساتھ آئے تھے واپس جا کر کوئی بیس منٹ تک عرفات کے ساتھ رہے۔ ہم باہر ان کا انتظار کرتے رہے۔ وہ باہر آئے تو مرجھائے ہوئے تھے انہوں نے کہا "میں ابوعمار (یاسر عرفات سے کہنے گیا تھا کہ وہ اقبال کی بات سنیں اگر انہوں نے اب نہ سنا تو پھر ہمارے لئے اُمید کی کوئی صورت نہیں۔

یہ عرفات سے میری آخری ملاقات تھی۔ اسرائیلی حکومت نے آخر کار 1994ء میں مجھے پروانہ راہداری جاری کردیا میں پہلے غزہ گیا اور وہاں انسانی حقوق کی تنظیم سے بات چیت کی میں نے عرفات کو پیغام بھیجا کہ میں غزہ میں ہوں میں نے انٹرویو کے لئے نہیں کہا ہر بار ان کے دفتر نے ہی مجھے شاید کسی کے کہنے پر بلایا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا۔ پہلے روز ہوٹل میں جہاں انسانی حقوق کی کانفرنس ہونے والی تھی مجھے بتایا گیا کہ کانفرنس نہیں ہونے دی جائے گی۔ عرفات اور ان کے گرد جمع ہونے والے لوگ ٹھگ ہیں اور اسرائیلی سے ملے ہوئے ہیں، ان کی ٹھگی کے اس موقع پر مغربی ذرائع ابلاغ اُن

کے بارے میں کچھ نہیں کہہ رہے وہ اچانک اچھے لوگ تسلیم کیئے جانے لگے ہیں۔

س: آپ تیس برس بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصے سے اسرائیلی، فلسطینی عرب مسئلہ، کا جائزہ لیتے آرہے ہیں آپ کے خیال میں امریکہ میں کھلے عام مذاکرات کرانا کیوں مشکل ہو گیا ہے؟

ج: اس کی بہترین وضاحت کوئسچن آف فلسطین (مسئلہ فلسطین) کے ایک اس باب میں ہو گئی ہے جس کا عنوان ہے ''صیہونیت کے شکار لوگوں کا نقطۂ نظر'' صیہونیوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے معتوب فلسطینیوں کا نقطۂ نظر سمجھیں، اس میں ایڈورڈ سعید نے دلائل دیتے ہوئے کہا ہے کہ صیہونیوں کے نقطۂ نظر کی فوقیت کو قبول کرنا جس میں فلسطینی عرب حقیقت کی قدر و قیمت کم تر ہو جاتی ہے دراصل مستشرقین کی روایت کا تسلسل ہے۔ (19) آج ''صورت حال پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ہے۔'' کیونکہ 1947ء یا 1948ء کے برعکس آج اسرائیل کا جواز امریکی طاقت اور اقتدار کے ادارے، ذرائع ابلاغ، محکمہ دفاع اور سی آئی اے سب ایک دوسرے سے منسلک ہو گئے ہیں۔ اسرائیل اور امریکہ کے تعلقات تک مختلف جہتیں اور مختلف پرتیں ہیں۔ اس صورت میں کسی کے لئے بھی یہ خیال کرنا کہ اس کی آواز سنی جائے گی ممکن نہیں اب کسی کو سکھانا بھی ممکن نہیں کیونکہ ہر طرف سے آوازیں آنا اور ہر طرح سے ڈرانا دھمکانا شروع ہو جاتا ہے یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ایک چھوٹے سے کالج میں پڑھانے لگا تھا، ہمپشائر نے مجھے وہ سب کچھ کرنے کی اجازت دی ہے جو میں کالج کے باہر کرنا چاہتا ہوں۔

س: اس سے پہلے آپ نے کہا تھا کہ آپ کو کارنیل میں کوئی قیمت ادا کرنا پڑی۔

ج: کارنیل میں ہی نہیں میں نے برسوں تک بھاری قیمت ادا کی ہے۔ میں اس کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔ یہ ایک طرح کا میکارتھی ازم ہے جس کے تحت چند آوازوں پر پابندیاں لگائی گئی ہیں۔ اس وقت چار یا پانچ افراد، نیویارک ٹائمز کے خارجہ امور پر لکھنے والے کالم نگار ہیں۔ ان میں سے ایک ولیم سیفائر ہیں اور دوسرے اے ایم روزن تھال ہیں۔ اور یہ دونوں دائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اسرائیلی لیکوڈ پارٹی کے حامی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی نہیں جو عرب اسرائیلی تنازع کے ضمن میں کوئی آزادانہ موقف اختیار کر سکے یا کم از کم عرب یا فلسطینی عوام کے جذبات، احساسات اور ضروریات کا اندازہ ہی کر سکے۔ کچھ یہی حال واشنگٹن پوسٹ، شکاگو ٹریبیون اور دوسرے بڑے اخبارات کا ہے۔

ہمہ جہتی ثقافتوں کے اس دور میں روزن تھال اسلام کو ''نفرت کی تہذیب'' کہتا ہے اور اس سے کوئی بھی باز پرس نہیں کرتا۔ ایڈورڈ سعید، نوم چومسکی سمیت نیویارک ٹائمز میں مشرق وسطٰی پر نہیں لکھ سکتے۔ میں تو ایک چھوٹا سا لکھنے والا ہوں حالانکہ میں ایک عرصے نیویارک ٹائمز میں لکھتا رہا ہوں۔ ہم اس اخبار میں یا واشنگٹن پوسٹ میں مشرق وسطٰی کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتے۔ یہ نہیں کہ ہم کوئی بُرے لکھنے والے ہیں بس ہمارے چھپنے پر پابندی ہے۔

میں اسے ذرائع ابلاغ پر یہودیوں کے کنٹرول کا معاملہ نہیں سمجھتا یہ خالص حماقت ہے یہ طاقت اور اجارہ داری کو استعمال کرنے کا ایک پیچیدہ نظام ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ بعض آراء اور نظریات کو روکنا مقصود ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر بااثر ایرانی اخبارات یہودیت کو ''نفرت کی تہذیب'' لکھنے لگیں تو دُنیا کیا کہے گی۔ تاہم ہم اس کی مذمت کریں گے۔

فیض احمد فیض

س: میں بیروت میں آپ کے ساتھ ''فیض احمد فیض'' اور ''ایڈورڈ سعید'' کی ملاقات کے بارے میں آپ سے کچھ سننا چاہوں گا۔

ج: یہ 1980ء کی بات ہے۔ ضیاء الحق پاکستان میں فوجی ڈکٹیٹر تھے۔ انہیں انسانی حقوق کے عظیم پجاریوں امریکہ اور نیویارک ٹائمز کے ناشروں کی بڑی حمایت حاصل تھی۔ فیض نے جنگ سے تباہ حال بیروت میں ایک قسم کی پناہ لے رکھی تھی وہ بیروت میں میرا لیکچر سننے آئے تھے۔ میں نے انہیں پیچھے بیٹھا دیکھا تو ان کے پاس گیا اور ایڈورڈ سے ان کا تعارف کرایا۔ چند برس بعد ایڈورڈ نے رسالہ ''ہارپر'' میں اس ملاقات کے بارے میں مضمون لکھا جس کا عنوان تھا۔ "The Mind of Winter Reflections on life in Exile."(20) فیض نے لبنان میں قیام کے دوران اپنے تجربات پر بڑی دل پذیر نظمیں کہیں، ایڈورڈ نے پہچان لیا کہ فیض عظیم شاعر ہیں ان سے باتیں کرنا اور ان سے سننا ایڈورڈ کو بہت اچھا لگا۔ ایک روز ہم ایک ریسٹورنٹ میں ڈنر کر رہے تھے کہ علاقے میں کرفیو لگ گیا اور لڑائی چھڑ گئی۔ ہم وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ فیض نے کئی نظمیں سنائیں جن کا میں ساتھ کے ساتھ ترجمہ کرتا رہا، باہر گولیاں چل رہی تھیں لیکن ہم باتیں

MashalBooks.org

کرتے رہے۔

س: سعید نے لکھا ہے کہ آپ نے ترجمہ کرنا چھوڑ دیا اور رات کو ہوا کو بارود نے بھر دیا۔

ج: ایک بار میں نے ترجمہ کرنا بند کر دیا۔ فیض اپنی نظمیں سناتے رہے۔ اردو شاعری کا اپنا ہی ایک غیر معمولی آہنگ ہے۔ ایک ہفتہ ہوا میں نے ایمہرسٹ میں فیض کے اشعار، اردو اور انگریزی میں سنائے آغا شاہد علی میرے ساتھ تھے۔ اکثر امریکی جو اردو کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فیض نے اردو شاعری وہاں سے شروع کی تھی جہاں اقبال نے چھوڑی تھی۔ جس طرح پیبلو نرودا نے ہسپانوی زبان کو اور ناظم حکمت نے ترکی کو فیض یاب کیا۔ اسی طرح فیض نے اردو زبان کو نئے اور جدید اسالیب آزاد نظم اور اردو اور فارسی کی کلاسیکی شاعری سے روشناس کیا۔ اس امتزاج سے فیض کی شاعری کی مقبولیت اور توانائی کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ فیض کی شاعری کی مقبولیت اور توانائی کا ایک سرچشمہ ان کی سماجی اور سیاسی بصیرت اور جہد و جہد بھی ہے۔ فیض کو اپنے سیاسی معتقدات کی بناء پر برسوں جیل میں رہنا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔

مستشرقیت

س: ایسا لگتا ہے کہ ایڈورڈ سعید کی سب سے بڑی عطا یہ ہے کہ اس نے بتایا کہ مغرب میں علم و فکر بالخصوص مشرق وسطیٰ کے بارے میں علم کی تخلیق اس طرح کی گئی ہے کہ اس سے سامراجی طاقتوں کے مفادات کی آبیاری ہوئی۔ یہ نظریہ پہلے اس کی کتاب "Orientalism" میں اور پھر کلچر اینڈ امپیریلزم میں پیش کیا گیا ہے۔(21)

ج: میں ذرا مختلف طریقے سے کہوں گا۔ میرے خیال میں ادبی نقاد کی حیثیت سے سعید کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس نے سامراج کو مغربی تہذیب کا مرکزی نقطہ بنا دیا۔ آپ مغرب میں گذشتہ چار سو برس کے تاریخی و سیاسی لٹریچر اور ادبی تخلیقات میں سب سے زیادہ اصرار اس بات پر دیکھیں گے کہ ان کی تہذیب کی تشکیل میں روشن خیالی کا بڑا دخل ہے جمہوریت، جمہوری اقدار اور فکری آزادی کو روشن خیالی کا ایک پہلو قرار دیا جاتا ہے لیکن امپیریلزم یا سامراج نے مغربی تہذیب کے خدوخال نمایاں کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے اس کا ذکر کرنے سے ہمیشہ گریز کیا جاتا ہے۔

سعید اپنی کتاب Orientalism میں مستشرقین کے بارے میں ہی نہیں کہتا، بلکہ طاقت یا

اقتدار کے ساتھ علم کا رشتہ، سامراج اور کلچر کا رشتہ اور تہذیب کی توسیع پسندی سے علم کا رشتہ دریافت کرتا ہے۔ چنانچہ وہ مغرب کی توسیع پسندی، تسلط اور سامراج کو اس کی تہذیب کا مرکزی نقطہ اور اساسی قوت قرار دیتا ہے۔ موسیقی، ادب، شاعری سیاست اور تاریخ نویسی اسی ذیل میں آتی ہے اس نے یہ اتنی مہارت، قوت اور استدلال سے کہا ہے کہ اس کے موقف کو کوئی بھی چیلنج نہیں کر سکا۔

س: کیا آپ نے اسلامی تہذیب، جنوب اور تیسری دنیا پر لکھنے والے لوگوں کے حوالے سے علمی اداروں میں کسی تبدیلی کا مشاہدہ کیا ہے؟

ج: جس طرح لسانیات میں تبدیلی آئی ہے اسی طرح علمی اداروں کے ضمن میں بھی آئی ہے۔ لسانیات میں دو ادوار ہیں: ایک چومسکی سے پہلے کا، دوسرا چومسکی کے بعد کا۔ ادبی تنقید اور تاریخی تحریروں میں بھی دو دور ہیں۔ ایک ایڈورڈ سعید کی کتاب "Orientalism" سے پہلے اور دوسرا اس کے بعد کا۔ اس میں کوئی شک ہی نہیں ہے۔ اب کیا مغرب میں اس نے اسلام کے مطالعے کا رجحان تبدیل کر دیا ہے؟ ہاں تبدیلی آئی ہے اچھی بھی اور بُری بھی۔ مثال کے طور پر کچھ تو سعید کے ردِ عمل میں لیکن بنیادی طور پر ان کی اپنی ضرورتوں اور تعصّبات کی بناء پر۔ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کو ہوا بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ ان میں علوم شرقیہ کے ایک ماہر برنارڈ لوئیس بھی شامل ہیں جن کی بڑی توقیر اور احترام ہے اور ان میں ہاورڈ بلوم ایسا بدنام زمانہ شخص بھی ہے جس نے "The Lucifer Principle" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں اسلام کو شیطانی اور ابلیسی تہذیب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ (22)

سربوں نے مسلمانوں کا قتل عام اور نسل کشی کرتے ہوئے یہی جواز پیش کیا کہ اسلام اور مسلمان وحشی ہیں۔ فسطائی سرب جرنلسٹوں سے کہتے کہ "آپ لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ ہم وہی کچھ کر رہے ہیں جو آپ کرنا چاہتے ہیں، یا جو آپ کے کرنے کا کام ہے کہ یہ ابلیسی مذہب اور ابلیسی تہذیب ہے۔"

ان دنوں اسلام اور مسلمانوں پر عالمانہ کام کرنے والوں کا ایک حلقہ ایسا ہے جو اُس معاملہ فہمی سے کام لے رہا ہے جو پچاس برس پہلے موجود نہیں تھی لیکن میں کہوں گا کہ سعید کی کتاب کا سب سے بڑا اور منفرد اثر اسلام کے دائرے سے باہر مرتب ہوا ہے کیونکہ اسلامی

MashalBooks.org

تہذیب ابھی تک سیاسی وجوہ کی بناء پر ہدف تنقید بنی ہوئی ہے کالوں اور افریقہ کی تاریخ، امریکہ میں نسلی تعلقات، ادبی تنقید، مغرب کی نوآبادیاتی توسیع پسندی، کے دور کی تاریخی تحریروں پر اس کا گہرا اثر ہوا ہے۔

س: تیسری دنیا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا اس پر اثرات مرتب ہوئے؟

ج: افسوس ہے کہ کوئی خاص نہیں ہوا۔ محض سعید اور اس کی کتاب کو کسی حد تک تقدس کا درجہ دیا گیا اس کے علاوہ تیسری دنیا میں تاریخ سے متعلق چند مقالے منظر پر آئے ہیں جن میں کتاب سے واقعی کچھ سیکھنے کا احساس ہوتا ہے۔ سب سے اچھی چیزیں دہلی کی جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کی طرف سے آئی ہیں۔ ان میں بھی رنجیت گوہا جیسے کم مشہور لکھنے والے شامل ہیں۔ (23) عربی میں متعدد نئی چیزیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں محمد عبدالجابری کی تحریریں شامل ہیں۔ یہ ہیں تو دلچسپ مگر ان میں کوئی خاص مغز نہیں ہے۔ (24)

اسلام کو ہوّا بنانا

س: کیا آپ تاریخ وار بتا سکتے ہیں کہ اسلام، مسلمانوں اور عربوں کو کب مغرب کے لئے خطرہ یا دشمن قرار دے کر ہدف بنایا جانے لگا؟

ج: یہ کوئی نئی واردات نہیں دسویں صدی میں پہلی مرتبہ اسلام کو آسیب بنا کر پیش کرنے کی کوششوں کو آغاز ہوا۔ اس موقعہ پر یورپی نقطۂ نظر سے یہ اتنا غلط بھی نہیں تھا کہ اسلام کو ایک وسعت پذیر تہذیب سمجھا گیا اس لئے اسے ایک خطرے اور دھمکی کی صورت میں دیکھا گیا۔ صلیبی جنگوں نے پہلی مرتبہ ترکوں اور عربوں کے بجائے مذہبی خطوط پر اسلام کو آسیب اور خطرہ قرار دیا۔ دوسری مرتبہ اس وقت ہوا جب انگریز اور فرانسیسی نوآبادکاروں کو مسلمانوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

مہدی سوڈانی نے 1885ء میں خرطوم کا محاصرہ کر کے جنرل چارلس جارج گورڈن کو قتل کر دیا۔ اس موقع پر اسلام کو غلط رنگ دینے کی بڑی کوشش کی گئی اور مسلمانوں کو جنونی کہا گیا۔ انہی نوآبادیاتی جنگوں کو اس صورت میں ہی یاد رکھا گیا کہ فلاں جنگ میں گورڈن کو پکڑا گیا، کوئی کسٹر مارا گیا۔ جو لاکھوں لوگ مارے گئے انہیں توجہ کے لائق نہ سمجھا گیا۔

1400 برس میں اب تیسرا موقع ہے کہ اسلام کو بدنام کرنے کی منظم کوشش کی گئی ہے۔ اس

MashalBooks.org

مرتبہ یہ کوششیں بڑی منظم ہیں اور تسلسل سے چلائی جا رہی ہیں کیونکہ ذرائع ابلاغ تبدیل ہوگئے ہیں آج ذرائع ابلاغ نے وسعت اختیار کر لی ہے۔

س: کیا اسلام کو بدنام کرنے کا عمل اس اتفاق رائے کا نتیجہ ہے جس کا اظہار نہیں ہوسکا تھا، یا ہاورڈ میں مل بیٹھنے والے لوگوں نے کہا کہ ہمیں اکٹھے ہو کر عربوں اور مسلمانوں کو بدنام کرنا چاہیے؟

ج: میرا نہیں خیال کہ کوئی سازش ہوئی ہے۔ بڑی سامراجی طاقتیں خاص طور پر جو جمہوری ہوں، طاقت یا محض لالچ کی بناء پر اپنے آپ کو حق بجانب ثابت نہیں کر سکتیں۔ اسے کوئی قبول نہیں کرے گا۔ جدید سامراج کے لئے عوام کو اپنی خصوصیات کا قائل کرنے کی غرض سے اپنے وجود کو جائز ثابت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے اسے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہیں ایک مفروضہ اور دوسرا مقصد، برطانیہ نے گوری نسل کا بوجھ سنبھالے رکھا یہ اس کا مقصد یا مشن تھا۔ فرانس نے غلام قوموں کو مہذب بنانا چاہا یہ اس کا مفروضہ تھا۔ امریکیوں کا مقدر طے تھا اور اس کا مقصد یا مشن جان ایف کینڈی کے بقول دنیا کی آزادی کا تحفظ کرنا اور اس پر پہرہ دینا ہے۔ ہر ایک کے سامنے کالی، پیلی رکاوٹ تھی اور آخر میں سرخ خطرہ موجود تھا جس کو تباہ کرتا تھا۔

سرد جنگ کے بعد مغربی طاقت مفروضے اور مشن دونوں سے محروم ہوگئی۔ اب مشن یا مقصد انسانی حقوق کی صورت میں نمایاں ہوا ہے۔ ایک ایسے ملک کے لئے جو ایک سو برس سے لاطینی امریکہ اور پوری دنیا میں آمریتوں کی حمایت کرتا آیا ہے یہ ایک عجیب مشن ہے۔ چومسکی اور ہرمن نے اس کے متعلق اپنی کتاب The Washington Connection and Third World Fascism میں لکھا ہے (25) ایسے ہی خطرہ کی تلاش میں اب انہوں نے اسلام کی طرف رُخ کیا ہے۔ یہ آسان بھی تھا کیونکہ اس کی ایک تاریخ ہے۔

س: اور یہ آسانی سے ہدف بن بھی سکتا ہے۔

ج: ہاں یہ کمزور ہے، اسلامی ممالک مغرب کے تیل کے وسائل کا گھر ہیں مغرب کو الجزائر اور مصر میں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ فلسطینیوں کی طرف سے بھی اور ایرانی انقلاب نے بھی اس کی مزاحمت کی ہے اس سے مغرب کو یہ تشویش لاحق ہوگئی ہے کہ اس کے مفادات خطرے میں ہیں۔ اسلام کی مخالفت کی بھی ایک تاریخ ہے۔ یہ تمام عوامل یکجا ہو گئے ہیں

اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے والے بھی موجود ہیں۔

س: اسلامی بنیاد پرستی پر ذرائع ابلاغ نے اپنے اپنے انداز سے حاشیہ آرائی کی ہے۔ کچھ پہلو ایسے ہیں جن پر سرے سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ مثال کے طور پر سعودی انداز ہے جو اس کی انتہائی شکل ہے۔ امریکیوں نے حزب اللہ، اور حماس اور مصر میں اخوان کے بارے میں بہت کچھ کہا سُنا ہے۔

ج: آپ نے بڑا دلچسپ مسئلہ چھیڑا ہے، سعودی عرب کی حکومت اسلام کی تاریخ میں سب سے بڑی بنیاد پرست حکومت رہی ہے۔ آج بھی ایرانی عورتیں تو موٹر گاڑی چلاسکتی ہیں لیکن سعودی عورتیں نہیں چلاسکتیں۔ ایران میں مرد اور عورتیں دفتروں میں اکٹھے کام کرتے ہیں۔ سعودی عرب میں ایسا کرنا ممکن نہیں۔ بنیاد پرستی کے اصولوں یا دائیں بازو کے نظریے کی رو سے سعودی عرب عملاً ایران سے کہیں زیادہ بنیاد پرست ہے۔ لیکن چونکہ وہ 1932ء سے امریکہ کا اتحادی چلا آرہا ہے اس لئے اس پر کسی نے کوئی بات نہیں کی۔

دیکھیں تو اس سے کہیں زیادہ حالات دگرگوں ہیں۔ سرد جنگ کے پورے زمانے میں جس کا آغاز 1945ء میں ہوا اور امریکہ نے عالمی طاقت کی حیثیت سے کردار سنبھالا، امریکہ نے اسلامی دنیا میں اسلام کو کمیونسٹ پارٹیوں کا فعال مدمقابل تسلیم کیا ہے، اس پورے عرصے میں مصر کے الاخوان امریکہ کے دشمن بنے رہے۔ امریکی حکومت نے سوڈان میں اسلامی حکومت کی حمایت کی۔ جنرل محمد جعفر النمیری سوڈانی اسلامی تحریک کے حامی تھے اس لئے امریکہ کے دوست تھے۔

امریکہ کے پاس مغربی یورپ اور ایشیا میں دو اہم وسیلے تھے ایک نیوکلیئر (ایٹمی) چھتری۔ دوسری اقتصادی بالا دستی۔ 1970ء کے عشرے کے اوائل میں امریکہ کے ان دونوں وسیلوں میں کمی آگئی۔ امریکہ اپنے اتحادیوں پر تفوق برقرار رکھنے کے لیے وسیلوں کی تلاش میں تھا اس نے مشرق وسطیٰ کا انتخاب کیا جہاں سے جاپان اور یورپ کی صنعتی معیشتوں کو توانائی کے وسائل میسر آتے تھے۔ اس خطے میں موثر اور محکم امریکی اثر، قیمتوں کو کنٹرول کرسکتا تھا اور یورپ اور جاپان کو یہ یقین دلاسکتا تھا کہ ''ہم آپ کو سستا تیل فراہم کرسکتے ہیں ہم آپ کے تیل کو مہنگا کرسکتے ہیں ہم آپ کی اقتصادی بقاء کو ضمانت دے سکتے ہیں۔''

یہ نکسن ڈاکٹرین کا زمانہ تھا اس کے تحت علاقائی طاقتوں کو علاقے میں امریکی اثر برقرار

MashalBooks.org

رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔مشرق وسطیٰ میں اس کردار کے لئے ایران اور اسرائیل کو چنا گیا۔امریکی محکمہ دفاع میں1970ء کی دہائی میں انہیں مشرق وسطیٰ میں امریکہ کی دو آنکھیں کہہ کر یاد کیا جاتا رہا۔

1978ء میں امریکہ سے20 بلین ڈالر کا فوجی سازوسامان حاصل کرنے کے بعد شاہ ایران فوجی طاقت بننے کے بوجھ تلے دب گئے ۔1979ء کا اسلامی انقلاب امریکی مفادات کے لئے شدید خطرہ بن گیا۔جس کی خطرناک شکل امریکیوں کو یرغمال بنانے کی صورت میں سامنے آئے۔

ایک سال کے اندر حالات کی ستم ظریفی کے سبب قطعاً مختلف واقعات رونما ہونے لگے۔ سوویت یونین نے افغانستان میں مداخلت کی۔ پاکستان میں ایک اسلامی بنیاد پرست ڈکٹیٹر کو ترقی ملی۔سی آئی اے کی مدد سے افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف اسلامی بنیاد پرست مزاحمت شروع ہوئی۔اب اسلامی بنیاد پرستوں کی سخت جان قسم نے مجاہدین کی صورت میں افغانستان میں اقتدار سنبھال لیا جو شیطانی سلطنت کا مقابلہ کر رہی ہے۔

1981ء سے1988ء کے درمیان انہوں نے اکیلے امریکہ سے اربوں ڈالر کے اسلحے حاصل کئے باقی کی امداد انہیں سعودی عرب نے امریکہ کی تحریک پر فراہم کی۔امریکی کارندے دنیائے اسلام میں افغانستان میں جہاد کے لئے مجاہد بھرتی کرتے رہے امریکہ نے کمیونزم کے خلاف اسلامی دنیا کو منظّم کرنے کے لئے اس موقع سے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔الجزائر، سوڈان،مصر،یمن اور فلسطین سے مجاہدین بھرتی کئے گئے۔غرض وہ ہر جگہ سے آئے۔سی آئی اے نے ان کی تربیت کی۔اسلحہ بھی سی آئی اے نے فراہم کیا میں نے اپنے بعض مضامین میں لکھا ہے کہ دنیائے اسلام میں دسویں صدی تک محض جدوجہد کے حوالے سے جہاد کا تصور موجود نہیں تھا امریکہ نے افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جہاد کا احیا کیا۔

تب سے ہر فعال مسلمان نے جن کا اسرائیل،الجزائر اور مصر سے تعلق تھا افغانستان میں تربیت پائی۔سی آئی اے کے لوگ اسے اسلامی ردعمل کا نام دیتے ہیں۔

امریکی ذرائع ابلاغ ان پہلوؤں کا ذکر نہیں کرتے، نیویارک ٹائمز کے امور خارجہ کے چار کالم نگار نہ تو تربیت یافتہ ہیں اور نہ ہی ان حقائق پر تبصرہ کرنے کے لئے وہ اپنے لئے تربیت ضروری سمجھتے ہیں۔

MashalBooks.org

س: مجاہدین کے لئے امریکی امداد کے پاکستانی معاشرے پر کیا منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

ج: ایک تو یہ کہ، منشیات اور اسلحے کی غیر معمولی بھر مار ہوگئی، دس بلین ڈالر کا اسلحہ پاکستان اور افغانستان میں بھیجا گیا۔ اس میں سے کم سے کم آدھا بین الاقوامی تجارت کا حصہ بن گیا۔ اس کا زیادہ حصہ پاکستان میں جمع ہے یہ اسی کا اثر ہے کہ پاکستان میں ہر تیسرا آدمی مسلح ہے اس کے پاس کلاشنکوف اور گرنیڈ لانچر اور خودکار اسلحے ہیں۔ چھوٹے جرائم بڑے جرائم بن گئے ہیں کیونکہ عام طور بھی ایسے ہتھیاروں سے مسلح ہیں جو خطرہ محسوس کرنے کی صورت میں قتل کرنے کے لئے آسانی سے استعمال کر لئے جاتے ہیں۔1979ء میں افغانستان میں انقلاب کے موقع پر پاکستان میں منشیات استعمال کرنے والے عادی نشہ بازوں کی تعداد ایک لاکھ دس ہزار تھی ان میں زیادہ تر افیم اور کچھ لوگ حشیش پیتے تھے۔ آج پاکستان میں نشہ کرنے والوں کی تعداد پچاس لاکھ ہوگئی ہے۔ پاکستان کے راستے افیون کی تجارت بڑھ گئی ہے یہ افغانستان اور ایران سے آتی ہے ایک اندازے کے مطابق افغانستان سے منشیات کی چار بلین ڈالر کی تجارت ہو رہی ہے اس سے پہلے جس ملک کی کل غیر ملکی برآمدات چھ بلین ڈالر کی تھیں اس میں چار بلین ڈالر کی منشیات کی تجارت شامل ہوگئی۔ پاکستان میں منشیات کا کاروبار کرنے والے امیروں کا ایک طبقہ پیدا ہوگیا ہے جو سیاست دانوں، نوکر شاہی اور پورٹ اتھارٹی کو پیسے کھلاتا ہے۔ ملک بھر کا سیاسی نظام ڈرگ مافیا کے جال میں پھنس گیا ہے یہاں کی حالت کولمبیا جتنی تو بُری نہیں البتہ اس کے قریب پہنچ گئی ہے۔

تیسرا اثر غالباً نہایت سنگین ہے۔ پاکستان ایک رنگا رنگ اور متنوع معاشرہ ہے۔ یہاں چھ نسلی گروپ باہم مل کر رہ رہے ہیں ان میں اختلاف بھی ہے اور اتفاق و تعاون بھی، اختلاف کچھ اس طرح کا ہے کہ ''تم بلوچی بولتے ہو اور میں اردو بولتا ہوں ہمارے بچے اکٹھے کھیلتے ہیں وہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے بھی ہیں۔ میرے بچے تو تمہارے بچے کو پیٹا ہے اس بات پر تو تکار ہو جاتی ہے کہ کس کا بچہ خراب ہے'' پہلے اختلاف باتوں تک رہتا تھا۔ آج گولیاں چل جاتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں پہلے نسلی اختلافات بالکل معمولی نوعیت کے مقامی اور گلی محلے تک محدود تھے اب بندوقیں آ گئی ہیں یہ چھوٹی چھوٹی باتیں جمع ہوتے ہوتے نسلی فسادات کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

MashalBooks.org

س: کیا پاکستان میں ترقی پسندانہ سیاسی ادارے یا ایسے حالات بن رہے ہیں؟

ج: اس وقت نہیں بن رہے۔ سوائے غیر سیاسی اور غیر رسمی حلقوں کے پاکستان، میں ترقی پسندانہ خیالات کا ابتدائی اظہار ذرائع ابلاغ میں ہو رہا ہے۔1987ء سے اخبارات آزاد ہیں یہ خاصی جاندار بات ہے، درحقیقت پاکستانی پریس پوری دنیا میں سب سے زیادہ جاندار پریس ہے۔ ہندوستان، مصر اور انڈونیشیا کے پریس سے بھی زیادہ جاندار ہے میرے مضامین ہر ہفتے چھپ رہے ہیں۔

عورتوں کی تحریک میں ترقی پسندی موجود ہے اور نمایاں ہے۔ ضیاء الحق کی حکومت عورتوں کے معاملے میں بڑی سخت تھی۔ اس نے عورتوں کے خلاف کئی آرڈیننس منظور کئے۔ حدود آرڈی نینس بھی ان میں شامل ہے جس کی رو سے عدالت میں عورت کی گواہی مرد کے مقابلے میں نصف قرار دے دی گئی ہے۔ قصاص سے متعلق آرڈی نینس کے مطابق اگر کوئی عورت مرد کے ہاتھوں قتل ہو جاتی ہے تو روپے دے کر قاتل بری ہو سکتا ہے۔

ان قوانین کے خلاف پہلی اہم مزاحمت ویمنز ایکشن فورم کی طرف سے ہوئی دس ہزار عورتیں سڑکوں پر نکل آئیں۔ حکومت کسی حد تک ڈر گئی پولیس نے انہیں مارا پیٹا۔ عوام جب فوج کے خلاف ہو جاتے ہیں تو بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے یعنی انہیں مارا جاتا ہے۔ عورتوں کو مارنے والی حکومت کو عام طور پر نہایت کمزور سمجھا جانے لگتا ہے۔ عورتیں نہایت سرگرم عمل ہیں۔ تحریک نسواں بڑی فعال ہے اور آج کے پاکستان میں خاصی ترقی پسند ہے۔ متعدد نان گورنمنٹل ارگنائزیشن (این جی اوز) ماحول، زمین کے تحفظ اور بڑے ڈیموں کے خلاف، جنہیں عالمی بینک کی حمایت حاصل ہے، سرگرم عمل ہیں اور ان کا سیاسی اثر ہے۔ لیکن سیاسی طاقت کی حیثیت سے ترقی پسندی سر دست کمزور اور معطل ہے۔

س: وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کا اس میں کتنا عمل دخل ہے؟ وہ ماڈرن، انگریزی بولنے والی پڑھی لکھی اور ترقی پسند خاتون ہیں ذرائع ابلاغ نے ان کا یہی امیج پیش کیا ہے۔

ج: عالمی تاریخ میں وہ پہلی مسلم خاتون ہیں جو وزیر اعظم بنی ہیں۔ انہوں نے ہاورڈ، ریڈکلف اور آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ آکسفورڈ یونین کی صدر چنی گئیں۔ وہ امتیازی حیثیت کی فصیح البیان مقررہ ہیں، دلکش اور جرأت مند خاتون ہیں۔ ضیاء الحق نے ان کے باپ کو پھانسی کی سزا دی اس کے بعد انہوں نے فوج آمریت کے خلاف جدوجہد کی۔ انہیں قید کی سزا دی

گئی اور گھر میں قید رکھا گیا انہوں نے جلاوطنی میں بھی زندگی گزاری ہے انہوں نے سیاسی مزاحمت، ظلم اور مشکلات کا سامنا کرنا۔

پاکستانی عوام نے1988ء میں انہیں وزیراعظم منتخب کر کے ان کی قربانیوں کا صلہ دیا۔لیکن وزیراعظم کی حیثیت سے وہ ناتجربہ کار، ناکام، الجھی ہوئی بے سمت اور بعض صورتوں میں گمراہ ثابت ہوئیں۔ بڑے بیوروکریٹس، فوجی افسروں اور مفاد پرستوں نے ان کے خلاف مہم شروع کی اور1995ء میں ان کی حکومت برطرف ہوگئی۔عوام نے محسوس کیا کہ مفاد پرستوں نے بےنظیر سے ناانصافی کی ہے۔وہ نوجوان تھیں انہیں سیکھنا تھا جس کا انہیں وقت نہیں مل سکا۔

1993ء میں ملک نے انہیں دوبارہ منتخب کرلیا۔انہوں نے دوبارہ وہی غلطیاں کیں بلکہ ان سے بھی زیادہ۔ وہ اور اُن کے شوہر آصف زرداری ناقابل یقین حد تک کرپٹ ثابت ہوئے۔ رشوت، قرضوں کی معافی اپنے حامیوں کے لئے بنکوں کے قرضے اور قانونی پابندیوں کی خلاف ورزی کرنے والوں سے چشم پوشی۔اس بھی بڑھ کر برائی یہ تھی کہ کرپشن کی تو کھلی چھٹی رہی لیکن پیداوار کی طرف دھیان ہی نہیں دیا گیا۔

امریکہ میں سول وار کے بعد جو حکومت برسراقتدار آئی وہ بہت کرپٹ تھی سابق صدور یولیسس ایس گرانٹ اور اینڈریو جانسن کے خلاف قانون حرکت میں آسکتا تھا اور وہ سزا پاسکتے تھے لیکن ان کے دور میں پیداوار بھی بڑھی۔وہ سرمایہ دار چور تھے۔

ہم نے پاکستان میں جو کچھ سیکھا وہ یہ ہے کہ جاگیردار چور، سرمایہ دار چور سے کہیں زیادہ برے ہوتے ہیں وہ کچھ پیدانہیں کرتے وہ دولت تخلیق نہیں کرتے اپنے لئے بھی نہیں، وہ صرف چراتے ہیں بےنظیر بھٹو نے یہی کچھ کیا۔

طالبان

س: اب افغانستان کی طرف چلتے ہیں اور وہاں جو صورتحال ہے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔آپ نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ طالبان کی تحریک کا صرف پاکستان سے ہی تعلق نہیں بلکہ امریکہ سے بھی ہے۔

ج: افغانستان کو امریکہ اور اس کے ذرائع ابلاغ نے مجرمانہ حد تک نظرانداز کیا ہے1979ء اور 1980ء میں جب افغان عوام نے سوویت مداخلت کی مزاحمت کرنا شروع کی تو پورا امریکہ

اور یورپ ان کی مدد کرنے لگا۔ ذرائع ابلاغ کے لئے یہ ایک اتنی بڑی خبر تھی کہ سی بی ایس نے ایک جھوٹی لڑائی کرانے کے لئے سرمایہ دیا تاکہ وہ اسے خصوصی نشریے کا موضوع بنا کر دنیا کو دکھا سکے۔ لیکن افغانستان سے روس کا انخلا ہوا تو ادھر توجہ ختم ہوگئی۔ ذرائع ابلاغ امریکی حکومت، امریکی اہل دانش اور نتیجتاً امریکی عوام نے افغانستان کو ترک کر دیا۔ وہ لوگ جنھوں نے مغربی پیسے اور مغرب کی اسلحے کے ساتھ مغرب کی جنگ لڑی انہوں نے اس عمل میں اپنا حلیہ بھی بگاڑ لیا اور پاکستان نے بھی جس نے سوویت یونین کے خاتمے میں حصہ بٹایا سرد جنگ کے ختم ہونے کے بعد اپنے آپ کو مکمل طور پر بے یارو مددگار پایا۔ طالبان اسی خلاء میں ابھرے اور نمایاں ہوئے۔

افغان مجاہدین ایک دوسرے سے جنگ میں اُلجھ گئے ان میں جنگ جو بھی تھے، اور منشیات کے سمگلر بھی۔ سی آئی اے کے نزدیک وہ منشیات کے سمگلر ہی تھے۔ ان میں دس گروہ ہیں جو ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ اسی دوران کئی اور گروہ بھی بن گئے ہیں۔ سوویت یونین کے حصے بخرے ہو جاتے ہیں، وہ جن جمہوریتوں پر مشتمل تھا اب آزاد ہوگئی ہیں ان میں وسطیٰ ایشیا کی چھ جمہوریتیں ہیں۔ ازبکستان، قازقستان، ترکمانستان، تاجکستان، کرغیزستان اور آذربائیجان، وسطیٰ ایشیاء کی ان چھ جمہوریتوں کی آبادی کی اکثریت مسلمان ہے یہ افغانستان کے بہت قریب ہیں یا پھر ان کی سرحدیں افغانستان سے ملتی ہیں۔ یہ تیل اور گیس کی دولت سے مالا مال ہیں اب تک ان کا تیل اور گیس سوویت یونین میں سے گزر کر جاتا تھا لیکن اب نیا کھیل شروع ہوگیا ہے۔ اب تیل اور گیس دنیا تک کیسے پہنچے؟ اس مرحلے میں امریکی کارپوریشنوں کا دخل شروع ہوتا ہے۔

امریکی کارپوریشنیں تیل اور گیس پر اجارہ قائم کرنا چاہتی ہیں۔ سرد جنگ کے بعد وسائل و ذرائع پر کس کا کنٹرول ہوتا ہے اور کس قیمت پر؟ ٹیکسا کو، اموکو اور یونوکال کی طرح کی کارپوریشنیں، تیل اور گیس کے ذخائر پر تصرف حاصل کرنے کے لئے وسطیٰ ایشیاء جا رہی ہیں۔ لیکن کیا یہ تیل اور گیس باہر لے جا سکیں گی؟ اس کے دو امکانات ہیں۔ ایک ترکی کے راستے دوسرے افغانستان کے راستے۔ پاکستان تک تیل اور گیس کی ترسیل۔ تیسرا راستہ ایران کا ہے لیکن ایران امریکہ کا مخالف ہے اس لئے امریکی کمپنیاں اس کے راستے پائپ لائینیں نہیں بچھانا چاہتیں۔ اب پاکستان اور افغانستان ہی رہ جاتے ہیں جن کے راستے

پائپ لائنیں گزاری جاسکتی ہیں اس طرح روسیوں سے بچا جاسکتا ہے۔
صدر کلنٹن نے ازبکستان، قازقستان، تاجکستان اور آذربائیجان کے صدور کو ذاتی طور پر ٹیلی فون کئے اور ان پر زور دیا کہ وہ پائپ لائنوں سے متعلق ٹھیکے دینے کی غرض سے معاہدوں پر دستخط کر دیں ان ٹھیکوں کی مالیت اربوں ڈالر تک پہنچے گی۔ یہ پائپ لائنیں ترکی اور افغانستان کے راستے پاکستان کی بندرگاہوں تک پہنچیں گی جہاں سے ٹینکر تیل لے کر مختلف علاقوں میں پہنچائیں گے۔ افغانستان میں پائپ لائنوں کی حفاظت کے لئے پاکستان اور امریکہ کو طالبان سے معاملہ کرنا پڑے گا۔ طالبان عورتوں کے مخالف ہیں۔ بعض اعلیٰ امریکی افسران کے پاس جاتے اور ان سے مذاکرات کرتے رہے ہیں عام تاثر یہ ہے کہ امریکہ طالبان کی حمایت کرتا ہے۔

س: آپ کو کیسے پتہ چلا کہ کلنٹن انتظامیہ کے افسر طالبان سے ملتے رہے ہیں۔

ج: نیویارک ٹائمز اور واشنگٹن پوسٹ میں غیر نمایاں چند سطری خبریں چھپی ہیں وہ بھی اس طرح کہ غور سے نہ دیکھیں تو سمجھ نہیں سکتے۔

س: امریکہ افغانستان میں اپنے علاقائی اور سیاسی مفادات پورے کرنے والے ایسے عناصر کی حمایت کیسے کر سکتا ہے جنہیں آپ نے سودائی، انتہائی تنگ نظر، عورت دشمن اور سخت انتہا پسند کہا ہے؟ کیا وہاں دوسرے گروپ موجود نہیں؟

ج: امریکہ کی اپنی منطق ہوگی۔ شاید اُسے ایسے عناصر کی حمایت درکار ہے جنہیں وہ لائق اعتماد سمجھتا ہو۔ بہر حال دوسرے گروہوں میں ازبک، ہزارے اور تاجک شامل ہیں افغانستان میں یہی چار بڑے نسلی گروہ ہیں۔ شمالی علاقے میں ازبکستان کے نزدیک ازبک رہتے ہیں، پھر ہزارہ ہیں یہ فارسی بولتے ہیں اسی بناء پر ایران ان پر اثر انداز ہوسکتا ہے، اس لئے وہ کلی طور پر لائق اعتماد نہیں۔ تاجک بھی فارسی بولتے ہیں وہ روس کے زیر اثر رہے ہیں لیکن چونکہ وہ فارسی بولتے ہیں اس لئے ان پر ایران کا گہرا اثر ہوسکتا ہے۔

طالبان نسلاً پشتون ہیں آبادی کے لحاظ سے انہیں اکثریت حاصل ہے۔ وہ پاکستان میں بھی بہت ہیں، جہاں ان کی تعداد ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ پاکستان امریکہ کا پرانا حلیف ہے اس کی وفاداریاں، مجرب اور آزمودہ ہیں۔ پاکستان کے نزدیک تیل اور گیس کی پائپ لائنیں ایسے لوگوں کے کنٹرول میں رہیں تو اچھا ہے جن میں پاکستان کی حکومت کو اثر ورسوخ

حاصل ہے اور جن پر ایران کا کوئی اثر نہیں۔

پشتون سنی ہیں تاجک جزوی طور پر شیعہ اور جزوی طور پر سُنی ہیں ہزارہ سب کے سب شیعہ ہیں۔ ازبک سُنی ہیں لیکن کی وفاداریاں بٹی ہوئی ہیں اور انہیں کبھی آزمایا نہیں گیا اس لئے کئی نسلی مصلحتیں ہیں۔ نسلی سیاست اور تاریخی رشتوں کا بھی عمل دخل ہے۔

امریکہ کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ کون بنیاد پرست اور کون ترقی پسند ہے۔ کون عورتوں سے اچھا سلوک کرتا ہے اور کون اُن سے بُرا سلوک کرتا ہے، یہ مسئلہ ہے ہی نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کون امریکہ یا اس کی کارپوریشنوں کے کنٹرول میں آنے والے تیل کے وسائل کے تحفظ کی ضمانت دے سکتا ہے۔

س: سوویت قبضے کے خلاف افغان مزاحمت کے ایک لیڈر گلبدین حکمت یار تھے ان کا نام اسلحے اور منشیات کی سمگلنگ کے سلسلے میں اکثر لیا جاتا رہا ہے آپ اُن کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟

ج: میں ان سے کئی بار ملا ہوں۔ میرے خیال میں وہ دوسروں کے مقابلے میں بُرے نہیں ہیں وہ قدرے زیادہ خطرناک سے ہیں لیکن وہ زیادہ ترقی پسند اور ماڈرن ہیں عورتوں کے سلسلے میں طالبان کے مقابلے میں زیادہ بہتر رویہ رکھتے ہیں۔

طالبان توقع سے بڑھ کر رجعت پسند ہیں۔ ان کی طاقت کا مرکز قندھار ہے۔ یہ افغانستان کا جنوبی صوبہ ہے گزشتہ برس میں نے دو ہفتے وہاں قیام کیا ایک دن میں نے اس گھر کے باہر، جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا، ڈھول پیٹنے کی آواز سنی۔ میں بھاگا بھاگا باہر گیا کہ دیکھوں کیا ہو رہا ہے؟ اس تباہ شدہ بازار میں جو بموں اور جنگ کے باعث کھنڈر بن گیا تھا بمشکل بارہ برس کی عمر کے ایک لڑکے کو جس کا سر گھٹا ہوا تھا گلے میں رسی بندھی تھی بازار میں کھینچ کر لایا جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک آدمی ڈھول پیٹتا جا رہا تھا میں نے پوچھا کہ لڑکے سے کیا قصور ہوا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ رنگے ہاتھوں؟ اس نے آخر کیا کیا ہے؟ وہ ٹینس کی گیند سے کھیل رہا تھا۔ گیند سے کھیلنا منع ہے میں طالبان کے ایک لیڈر کا انٹرویو لینے گیا، انہوں نے مجھے بتایا کہ ہم نے گیند سے کھیلنے کی ممانعت کر رکھی ہے کیونکہ اس سے مردوں کو ترغیب ملتی ہے۔ یہ منطق لڑکوں کو کھیل کود سے باز رکھنے کے سلسلے میں کارگر ہے۔ اسی منطق کے تحت عورتوں کو پردے میں اور گھروں کی چاردیواری کے اندر

رکھا جاتا ہے۔اسے آپ پاگل پن ہی کہہ سکتے ہیں۔

ایک اور وقت میں نے ایک چوکیدار کو روتے دیکھا تو پوچھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے؟اس نے بتایا کہ مجھ سے میرا ریڈیو چھین لیا گیا ہے وہ کیوں؟اس لئے کہ میں اس پر گانا سن رہا تھا۔ طالبان نے گانے پر پابندی لگا رکھی ہے جو لوگ موسیقی اور کھیل پر پابندی لگاتے ہیں وہ ایران کی اسلامی حکومت سے پچاس نوری سال پیچھے ہیں۔

امریکہ کی اسسٹنٹ سیکرٹری آف سٹیٹ برائے جنوبی ایشیاء، رابن رافیل، صدر کلنٹن کے ساتھ کالج میں پڑھتی رہی ہیں اس زمانے سے دونوں میں دوستی چلی آتی ہے ان کا تقرر بھی اس تعلق کی بنا پر ہوا۔ وہ اسلام آباد سے ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر طالبان کے لیڈروں سے ملنے قندھار گئیں۔ اس حرکت کے بعد انہیں چین یا کسی اور جگہ انسانی حقوق کے بارے میں بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔ امریکی حکومت کے افسر جب انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں تو وہ جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں وہ دوغلوں اور جھوٹوں کا ایک گروہ ہیں آپ اُن کے بارے میں سنجیدہ رویہ نہیں اپنا سکتے۔

چودھراہٹ کی تشکیل نو

س: 1970ء کے عشرے میں نکارا گوا، ایران، انگولا، موزمبیق اور دوسری جگہوں میں بغاوت، بیداری اور انقلابی سرگرمیوں کی ایک لہر سی آئی تھی سامراجی نظام کا اس پر کیا ردِعمل ہوا اور وہ اپنے نظریے اور اپنی چودھراہٹ کی تشکیل نو میں کیسے کامیاب ہوا؟

ج: میرے نزدیک دوسری جنگ عالمگیر کے بعد جدید تاریخ میں ویت نام کی جنگ نہایت اہم ترین واقعے کا درجہ رکھتی ہے کیونکہ اس نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے فوجی عزائم اور پسندیدگیوں اور از سر نو تعین کیا۔1945ء اور1965ء کے درمیان امریکہ کو ایٹمی اسلحہ رکھنے، استعمال کرنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کی صلاحیت کی بنا پر کسی بھی طاقت یا طاقتوں کے گروہ پر فوجی برتری حاصل تھی۔ لیکن1968ء تک سوویت یونین نے بین البراعظمی بیلسٹک مزائیل تیار کر لئے تھے اور دو ایٹمی آبدوزیں بنالی تھیں۔ امریکہ اس وقت تک وسیع پیمانے پر ایٹمی اسلحے استعمال کرنے کے اصول پر عمل پیرا تھا لیکن اب اُس نے حکمت عملی بدل لی اور باہمی تباہی کا راستہ اختیار کر لیا۔ گویا ہم پاگل پن کی حد کو پہنچ گئے۔ جس نے امریکہ کی فوجی برتری کو بڑی حد تک ختم کر دیا۔ یورپ اور جاپان اقتصادی لحاظ

سے بحال ہوگئے۔ عالمی سطح پر جونیئر پارٹنر کا کردار ادا کرنے کی بجائے اب وہ اقتصادی اعتبار سے امریکہ کے ہم پلہ ہوگئے تھے۔ اپنے اتحادیوں پر امریکہ کا اقتصادی حربہ کمزور ہوگیا۔

1945ء اور 1965ء کے درمیانی عرصے میں امریکہ نے لاطینی امریکہ، مشرق وسطیٰ، افریقہ اور ایشیاء کے تیسری دنیا کے ملکوں میں دخل اندازی کی صلاحیت اور اپنی مرضی چلانا شروع کی۔ جیکب آربنیز نے امریکہ کی مرضی نہ مانی اسی بناء پر انہیں محرومِ اقتدار کر دیا گیا۔ امریکہ اور اس کے برطانوی حلیفوں کو ایران میں محمد مصدق پسند نہیں آئے۔ سو اُن سے نجات حاصل کر لی گئی۔ کانگو میں پٹرمیں لومبا امریکی مفادات کے لئے خطرہ بنے سو انہیں فارغ کر دیا گیا۔ یہ تمام حربے کامیاب رہے اور امریکہ کو اس کی بہت کم قیمت ادا کرنا پڑی۔ 1958ء میں ہنری کیسنجر نے انہیں محدود جنگیں قرار دیا۔ زبگنیو بریزنسکی نے انہیں نہ دکھائی دینے والی جنگیں کہا ہنٹ ٹنگٹن انہیں فراموش شدہ جنگیں کہتا ہے۔ مطلب یہ کہ مداخلت کرنے والی طاقت انہیں نتائج کے لحاظ سے محدود قرار دیتی ہے۔ امریکی عوام کے لئے وہ نہ دکھائی دینے والی جنگیں تھیں امریکی ذرائع نے انہیں بھلا دیا تھا۔

ویت نام نے صورت حال بدل ڈالی۔ جنگ جسے محدود سمجھا گیا تھا اس کے نتیجے میں 57,000 جانیں تلف ہوئیں۔ 230,000 افراد زخمی ہوئے قریباً 220 بلین ڈالر خرچ ہوئے اور ہزاروں امریکی طیارے تباہ ہوئے جنگ کے خلاف تحریک اور گرجا گھروں اور ٹریڈ یونینوں کی مخالفت نے امریکی انتظامی کو باور کرا دیا کہ اگرچہ بیرونی علاقوں میں فوجی لحاظ سے دخل دینے کی اس کی صلاحیت ختم نہیں ہوئی لیکن اس نے حوصلہ ہار دیا ہے۔ امریکی طاقت کا ایک اضافی فائدہ یہ تھا کہ اس کی خارجہ پالیسی کو سب کی حمایت حاصل تھی۔ 1968ء تک یہ تمام محرکات تدریجاً ختم ہوگئے۔ امریکی انتظامی کو اپنی پالیسی تبدیل کرنے کا یا اس کی انحطاط پذیر طاقت بحال کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس نے اس کی تشکیل نو یا اصلاح کرنے کی بجائے اسے بحال کرنے کا فیصلہ کیا بحالی کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے چاروں ستون سابق طاقت کے ساتھ بحال کرنے کی حکمت عملی اپنالی ہے نتیجہ یہ ہوا، کہ بنیادی اہمیت کے حامل اسلحے کے ضمن میں وسیع اور نمایاں تبدیل قبول کر لی گئی، امریکہ نے پہلے حملہ کرنے کی صلاحیت حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ دوسرے ایٹمی اسلحے کے

MashalBooks.org

استعمال میں جو امتناعی حد مقرر کی گئی تھی اُسے گرانا شروع کر دیا۔ فوجی برتری حاصل کرنے کے یہی دو طریقے تھے۔

امریکہ کی فوجی برتری بحال کرنے کے لئے ''بی۔1'' بمبار طیارے، ''ایم ایکس'' میزائیل اور بالا آخر سٹار وار ہی وسیلہ رہ گئی تھی۔ چھوٹے ایٹمی میزائیل، درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے کروز میزائیل، یہ فنی لحاظ سے موثر میزائیل ہیں وہ فوجی وسیلے تھے جن کی بنا پر سوویت یونین کو دھمکی دی جاسکتی تھی کہ دیکھو کہ ہم میدان جنگ میں ضرورت پڑنے پر ایٹمی ہتھیار استعمال کر سکتے ہیں اس لئے اگر ہم کہیں مداخلت کریں تو تم دخل نہ دینا۔ لیکن اس طرح کرنے کا عجیب اور ملا جلا اثر ہوا۔ ایک طرف اس نے اسلحے کی دوڑ کی مخالفت میں اضافہ کر دیا دوسری جانب اس نے امریکہ اور یورپ میں زیادہ تر لوگوں کو ڈرا دیا۔ ایٹمی اسلحے کے خلاف تحریک شروع ہوگئی۔ بہر حال حلیفوں پر برتری حاصل کرنے کی خاطر امریکہ نے اپنی توجہ بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل سے ہٹا کر مشرق وسطیٰ کی طرف کر لی۔ ان کے خیال میں یہ علاقہ ہے جس کے تیل کے وسائل پر یورپ اور جاپان کا انحصار ہے، اگر امریکہ کو فیصلہ کرنا پڑا کہ کتنی مقدار میں تیل کا حصول اور اس پر کتنا خرچ برداشت کیا جانا ضروری ہے تو اس صورت میں اُسے اپنے حلیفوں پر برتری حاصل کرنے کا وسیلہ میسر آجائے گا۔

دخل اندازی کی صلاحیت پر حصول کے لئے نکسن ڈاکٹرین وضع کی گئی اس کا مقصد دنیا کے تمام اہم علاقوں میں علاقائی طاقتیں پیدا کرنا انہیں بہترین اسلحے سے لیس کرنا اور ضرورت پڑنے پر ان کی حمایت کرنا تھا۔ بحریہ کو جدید خطوط پر منظم کرنا تیزی سے حرکت کرنے والی افواج منظم کرنا اور علاقائی سطح پر حلیف بنانا تھا۔ 1970ء اور 1978ء کے درمیانی عرصے میں ایران نے بیس ارب ڈالر کے اسلحے حاصل کئے، اسرائیل کو 33 ارب ڈالر امداد کی صورت میں ملے۔

خارجہ پالیسی کو جائز ثابت کرنے کے لئے نئے نعرے اور نئی لفاظی تلاش کی گئی انسانی حقوق اور امن کے لئے ایک نیا ڈھانچہ دینا اسی ذیل میں آتا ہے۔

اب مختصراً اس سارے عمل کے اقتصادی پہلو پر ایک نظر کر لینی چاہیے۔ سرمایہ داری کا ڈھانچہ اس عرصے میں بدلنے لگا۔ بین الاقوامی تعلقات کے روشن خیال سکالروں کی اکثریت نے اس کا نوٹس نہیں لیا۔ بڑی بڑی کثیر القومی کارپوریشنوں نے ان علاقوں سے

MashalBooks.org

نکل کر جہاں افرادی طاقت مہنگی تھی، ان علاقوں کا رخ کرنا شروع کیا جہاں کم مزدوری دینا پڑتی تھی۔ ان ملکوں کو کثیر القومی کارپوریشنیں ''برآمدات کے پلیٹ فارم'' کہتی تھیں۔ اس طرح برآمدی پلیٹ فارم بھی قائم ہوئے اور علاقائی سطح پر اثر رکھنے والے بھی نمایاں ہوئے۔ لاطینی امریکہ میں برازیل، ارجن ٹائن اور چلی امریکی طاقت کے علاقائی مراکز تھے۔ ان ملکوں نے کثیر القومی کارپوریشنوں کے لئے برآمدات کے پلیٹ فارم کا بھی کام دیا۔ ایشیاء میں انڈونیشیا جنوبی کوریا ملائشیا اور کم تر درجے میں فلپائن، نکسن ڈاکٹرین کی علاقائی موثر طاقتیں تھیں جو کثیر القومی کارپوریشنوں کے لئے برآمدی پلیٹ فارم بنیں۔ مشرق وسطیٰ میں ایران اور اسرائیل وہی خدمت انجام دے رہے تھے۔ افریقہ میں زیادہ تر امکانات کا کھیل تھا۔ نائیجریا اریٹیریا اور جنوبی افریقہ میں تین ملک ایسے تھے جو امریکی مفادات کے لئے کام آسکتے تھے۔

میں جس نکتے پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ سامراج کے فوجی مقاصد اور سیاسی معاشیات میں ہم آہنگی ہے۔ دوسرے میرا نکتہ یہ ہے کہ عالمی سرمایہ داری کا ڈھانچہ جو آج گلوبلائزیشن کہلاتا ہے 1970ء کی دہائی میں بدلنا شروع ہوا تھا۔ یہ عمل کسی حد تک موثر ہونے لگا ہے خاص طور پر مشرقی ایشیا میں لاطینی امریکہ میں بھی یہ ایک موثر شکل اختیار کرنے لگا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں یہ صورت نہیں۔ یہاں خلیجی جنگ کے بعد امریکی طاقت میں اضافہ ہوا ہے۔ مشرق وسطیٰ تیزی سے حرکت کرنے والے امریکی فوج کا اڈہ بن گیا ہے۔ امریکی بحریہ نے خلیج فارس میں مستقل ڈیرہ ڈال لیا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں امریکہ کا فوجی ارتکاز بڑھا ہے۔ اس کی فوجی سیاسی طاقت مضبوط ہوئی ہے، لیکن اس کی اقتصادی جڑیں کمزور ہوگئی ہیں۔ اس لئے کہ یہ یک طرفہ ہیں مشرق وسطیٰ بنیادی طور پر خام مال فراہم کرتا ہے یہ برآمدات کا پلیٹ فارم نہیں۔

ایک دوسری صورت حال یہ ہے کہ بے اطمینانی موجود ہے۔ مثال کے طور پر فلسطین کے مسئلے کے ضمن میں جوڑ توڑ تو کیا جاتا رہا لیکن اسے حل نہیں کیا گیا یہ کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خطرناک صورت اختیار کرسکتا ہے۔ عراق کو پیٹا اور دبا دیا گیا ہے پانچ لاکھ عراقی بچے کم خوراکی اور علاج نہ ہونے کے سبب سے ہلاک ہوگئے ہیں۔ وہاں ایسے حالات پیدا نہیں ہوئے جن میں اقتدار کو مستحکم کیا جاسکتا ہو۔ ایران کو قرنطینہ میں

رکھا گیا ہے۔ دنیا سے الگ تھلگ چھ کروڑ آبادی کے ملک کو کتنی دیر تک قرنطینہ میں رکھا جاسکتا ہے؟ چنانچہ امریکی طاقت، مشرق وسطیٰ میں خاصی وسعت اختیار کرنے کے باوجود مقامی مزاحمتی تحریکوں، مخالف رہنماؤں یا صورتحال کے عدم استحکام سے دوچار ہے۔

س: آپ نے جو کچھ بتایا ہے اس کے علاوہ ترقی پذیر دنیا پر عالمی بنک اور آئی ایم ایف کے ذریعے، نئی آزادانہ اقتصادی اصلاحات کا نفاذ کیا جارہا ہے۔ ان اصلاحات کے تحت مقامی مصنوعات کے تحفظ کے تدابیر کی نفی کی جارہی ہے عوامی بہبود وفلاح کا پروگرام ختم اور نج کاری کی جارہی ہے۔ کیا یہ سامراجی اجارہ داری کی بحالی کا حصہ ہے؟

ج: ہاں لیکن اس کا آگے بڑھنا مشکل ہورہا ہے۔ کارٹر انتظامیہ کے دورِ اقتدار میں انسانی حقوق کا چرچا زور شور سے جاری رہا۔ لیکن حقیقت میں امریکہ کے علاقائی حلیف زیادہ تر جابر آمر تھے۔ مشرق وسطیٰ میں ایران وسعودی عرب، جنوبی ایشیاء، انڈونیشیا، جنوبی کوریا ابھی تک جبر سے کام لے رہے ہیں۔ مارکوس کے دور کا فلپائن، برازیل میں فوجی جنرل، ارجن ٹائن میں قاتل جنرل، چلی میں پنوشے، یہ سب فسطائی حکومتیں تھیں۔ جو برآمدات کے لئے پلیٹ فارم فراہم کررہی تھیں۔

1978ء اور 1979ء میں غیر متوقع طور پر امریکہ کے پالیسی سازوں اور مشرق وسطیٰ میں ماہروں کو مشکل درپیش رہی۔ اس دوران ایران میں انقلاب برپا ہوگیا۔ امریکی پالیسی سازوں نے ایرانی انقلاب کا جو تجزیہ کیا، وہ بڑا عجیب ہے۔ اس کے مطابق شاہ ایران نے کم وقت میں بے تحاشہ اسلحہ خریدا جس سے ان کی کمر ٹوٹ گئی دوسرے وہ بہت زیادہ آمرِ اور مطلق العنان تھے انہوں نے کوئی ایسا طریقہ نہیں رہنے دیا جو لوگوں کے جذبات کے اظہار کا وسیلہ ثابت ہوتا۔ ایران میں 1980ء کے انقلاب کے بعد امریکہ کی پالیسی میں تدریجاً تبدیلی آنا شروع ہوئی اور اُن پر کھلا کہ ایسا ہونا ہر جگہ ممکن نہیں۔ ترقیاتی فسطائیت سے سیاسی آزادی کی طرف برائے نام پیش قدمی بھی ممکن نہیں۔ اس ضمن میں فلپائن کی مثال دی جاسکتی ہے۔ اسی طرح مصر میں محدود سیاسی آزادی کو پیشتر اقتصادی آزادی کا وسیلہ بنانا ممکن نہیں ہوسکا۔ یہی طریقہ جنوبی کوریا میں اپنایا گیا لیکن کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ کوشش تو بہت کی گئی لیکن وہاں فوج بہت مضبوط ہے اس نے ایک نہیں چلنے دی۔ انڈونیشیا میں فسطائیت سے آزاد جمہوریت کی طرف تدریجی پیش رفت کی کوشش بھی ناکام رہی، یہی

وجہ ہے کہ امریکی پالیسی ساز چین میں انسانی حقوق کی تو بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے ہیں لیکن جب انڈونیشیا کا ذکر آئے تو دوسری جانب دیکھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ یہ جانتے ہیں کہ کرۂ ارض پر انڈونیشیا سے بڑھ کر شاید ہی کسی دوسرے ملک نے انسانی حقوق پامال کئے ہوں۔ کئی ممالک ہیں جنہوں نے انسانی حقوق کی بڑھ چڑھ کر خلاف ورزی کی ہے ان میں انڈونیشیا جنوبی کوریا، اسرائیل اور ترکی شامل ہیں۔ یہ سبھی ممالک تعلقات کے ضمن میں امریکہ کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔

س: مشرق وسطیٰ کے تعلق میں امریکی پالیسی کی غایت فوجی وسائل کو ترقی دینا ہے۔ نکسن کے وزیر دفاع میلون لیرڈ نے اسرائیل کو مقامی سپاہی قرار دیا جو گشت پر ہے اور علاقے کی حفاظت کر رہا ہے۔(26) اگر یہی معاملہ تھا تو امریکہ نے اسرائیل کو خلیجی جنگ سے کیوں باہر رکھا؟

ج: اسرائیل کو اس ملک (امریکہ) میں مسلسل فوجی حکمت عملی کا اثاثہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ میں نے اسے فوجی وسیلے کے طور پر کام کرتے نہیں دیکھا۔ لفاظی حقیقت پر غالب رہی ہے۔ اگر آپ طویل زمینی جنگ کا ذکر نہیں کر رہے ہیں تو اسرائیل، فرانس یا برطانیہ بلکہ چین سے بھی کہیں زیادہ جنگی صلاحیت کا حامل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ چین کا علاقہ بہت وسیع ہے اور مکمل طور پر اور طرح کا ملک ہے۔ اسرائیل کی طاقت کی موجودگی کے بارے میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ کیا مقصد حاصل کر رہی ہے؟ خلیجی جنگ کے دوران امریکی پالیسی کے لئے سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ اسرائیل کو جنگ میں شریک کرنے کی بجائے اسے جنگ سے کیسے باہر رکھا جائے؟ امریکہ کے فوجی منصوبہ سازوں کو سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ صدام حسین کہیں اسرائیل کو جنگ میں شرکت پر مجبور نہ کر دیں۔ یہ کس قسم کا فوجی اثاثہ ہے! میرے لئے یہ کہنا ناقابل فہم ہے؟

اسرائیل کا ایک اہم مقصد علاقے کو کسی حد تک غیر مستحکم رکھنا ہے۔ میں نے آج ہی سنا ہے کہ اسرائیلی طیارے لبنان پر پھر سے حملے کرنے لگے ہیں۔ سر دست یہی لگتا ہے کہ مشرق وسطیٰ میں امریکی طاقت کا بیشتر انحصار اسرائیل کی قوت پر نہیں، وہ عرب حکومتوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ آج مشرق وسطیٰ میں مسلح اقلیتیں اکثریت پر حاوی اور حکمران ہیں۔ سعودی، مصری اور اردنی تمام حکومتیں اقلیتیں ہیں جو اپنے عوام پر حاکم ہیں۔ یہ غیر محفوظ

حکومتیں ہیں۔ وہ بیرونی طاقتوں کی بجائے اپنے عوام سے زیادہ خوفزدہ ہیں اس لئے وہ امریکہ اور جہاں ضرورت پڑی اسرائیل سے ہر قیمت پر تعاون کرنے کے لئے تیار رہتی ہیں۔ چنانچہ مشرق وسطیٰ میں امریکی طاقت، عربوں کی کمزوری پر منحصر ہے یہ صورت کب تک برقرار رہ سکتی ہے؟

س: آپ کے خیال میں اسرائیل کا مستقبل کیا ہے؟

ج: وقتی طور پر نہایت روشن اور طاقتور لیکن لمبے عرصے کے تناظر میں بہت تاریک۔

س: یہ آپ کس بناء پر کہتے ہیں؟

ج: اسرائیلی حکومت گزشتہ دس برس سے اپنے عرب ہمسایوں کے ساتھ امن قائم رکھنے کا موقع گنوا رہی ہے۔ اسرائیلی حکام گذشتہ 45 برس سے کہتے آ رہے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ انہیں تسلیم کیا جائے امن کے لئے وہی واحد بنیاد ہے۔ اب ہر عرب حکومت اور پی ایل او کھلے عام تسلیم کرتے ہیں کہ اسرائیل کو قائم رہنے کا حق ہے۔ انہوں نے بائیکاٹ ختم کر دیا ہے۔ سب سے بڑے ملک مصر نے اسرائیل سے مکمل امن قائم کر لیا ہے۔ پی ایل او نے بھی اسرائیل سے مکمل امن قائم کر لیا ہے۔ اردن کے شاہ حسین نے اسرائیل سے مکمل امن قائم کر لیا ہے۔ لیکن اسرائیلی فلسطینیوں کی زمینیں ہتھیانے اور اپنی آبادیاں بسانے میں مصروف ہیں۔

اسرائیلیوں کی پالیسی یہ ہے کہ عربوں کو یقین دلایا جائے کہ وہ خواہ جو کچھ بھی دینا چاہیں، اسرائیل اپنی شرائط پر امن چاہتا ہے، اسے عربوں سے مزید علاقہ چاہیے اور عرب اس کے ہاتھوں مزید ذلیل اور خوار ہو رہے ہیں۔ اسرائیل مزید توسیع پسندی چاہتا ہے۔ وہ اس طرح باقی نہیں رہ سکتا۔ اسرائیل ایک چھوٹا ملک ہے اس کی آبادی 55 لاکھ ہے۔ عرب زیادہ ہیں۔ اس لمحے وہ کمزور ہیں غیر منظّم ہیں پست حوصلہ ہیں اور ملک فروخت کرنے والوں کا ایک گروہ ان جگہوں پر حکومت کر رہا ہے۔ یہ کوئی مستقل صورت نہیں ایک دن آئے گا جب عرب اپنے آپ کو منظّم کریں گے ایک بار منظّم ہو گئے تو آپ ایک مختلف تاریخ رقم ہوتے دیکھیں گے۔ یہ خوبصورت نہیں ہوگی، درحقیقت میں اس سے خوفزدہ ہوں۔

س: نیٹو سوویت یونین کے زیر اثر مشرقی یورپ کی سابق ریاستوں کو اپنے اندر شامل کرنا چاہتی ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: ایسا دکھائی دیتا ہے کہ صدر امریکہ نیٹو کو وسعت دینے کا عزم رکھتے ہیں اس کے لئے وہ اس میں چیکوسلاویہ ہنگری پولینڈ اور رومانیہ کو شامل کرنا چاہتے ہیں۔ امریکہ کی نئی وزیر خارجہ میڈیلین آلبرائیٹ نیٹو کی توسیع کی بڑی مضبوط اور پُر جوش خواہش مند ہیں۔ میرے خیال میں یہ سوچنا صحیح ہے کہ امریکہ کی سفارت کاری نیٹو کی توسیع کے لئے کام کرے گی وہ کیا کرے گی؟ میرے نزدیک یہ بہت خطرناک ہے اس پُر خطر چال کے سبب سے ایک اور سرد جنگ کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔ روسی خارجہ پالیسی کو اگر کوئی شے متاثر اور متحرک کر سکتی ہے تو وہ حملے کا خوف ہے۔ نپولین کے حملے کے بعد سے روس پر مغرب کی جانب سے تین بار اور حملے ہو چکے ہیں آخر بار ہٹلر نے حملہ کیا تھا جس میں روسیوں کے 3 کروڑ افراد مارے گئے یہ سارے حملے درمیان ریاستوں، پولینڈ اور چیکوسلاویہ میں سے ہوتے آئے تھے۔ اب اگر نیٹو کو وسعت دی جاتی ہے اور اس کا چاہے کچھ بھی جواز پیش کیا جاتا ہے اور زبانی کلامی روس کے خدشات دور کرنے کی چاہے کتنی ہی کوشش کی جاتی ہے روس کے خدشات دور نہیں ہوں گے۔ اس وقت شاید روس کچھ نہ کر سکے کہ وہ کمزور ہے وہ انتشار کا بھی شکار ہے اور اس کی طاقت منتشر ہے لیکن ایک دن آئے گا جب وہ اپنے آپ کو منظم کرے گا۔ اس کی کمزوری کو مستقل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ہر ایسی پالیسی جو سراسر مفروضے کی بنا پر شروع کی جاتی ہے کہ کسی کو ہمیشہ کے لئے کمزور رکھا جا سکتا ہے، ناکامی اس کا مقدر ہوتی ہے معاہدہ وارسائی کو یہی معاملہ پیش آیا۔ اس کا محرک یہ خیال تھا کہ جرمنی کے ساتھ ایسا معاہدہ کیا جائے جو اسے ہمیشہ کے لئے کمزور رکھ سکے۔ یہ تو نہیں ہوا، الٹا جرمنوں میں شدت کی نفرت پیدا ہوئی جو اس درجہ بڑھی کہ ایک اور جنگ کا سبب بن گئی آج ہم یہی کچھ روس کے ساتھ کر رہے ہیں۔

وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ نیٹو کی توسیع یورپ میں امریکی طاقت اور بالادستی برقرار رکھنے کا میکنزیم یا وسیلہ ہے چیک ری پبلک، پولینڈ اور ہنگری نیٹو میں شامل ہوتے ہیں تو یہ تینوں نئے ممبر ہوں گے (میں سردست ان تینوں کی بات کر رہا ہوں) یہ نیٹو میں امریکہ کے کردار کی حمایت کریں گے اور امریکہ کو مثال کے طور پر فرانس کے اثر کو محدود کرنے کے لئے مزید وزن چاہیے، ہوگا، فرانس جو آزاد یورپ کے لئے زور لگا رہا ہے۔

دوسرے سرد جنگ کے خاتمے سے یورپ میں طاقت کے نئے توازن کی تلاش شروع ہو گئی

ہے۔ مجھے صورتحال کچھ اس طرح کی دکھائی دے رہی ہے، جو واٹرلو کے میدان جنگ میں نپولین کی شکست اور نپولین کے دور کے فرانس کے زوال کے سبب سے پیدا ہوئی تھی۔ فرانس اور برطانیہ کا شاہی (یا نوآبادیاتی) مقبوضہ جات کے لئے ایک دوسرے سے مقابلہ رہا ہے۔ وہ ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا کے حصوں پر قبضے کے لئے آپس میں لڑتے رہے ہیں۔ افریقہ کے حصوں کے لئے بھی ان میں مقابلہ جاری رہا۔ بالآخر نپولین عالمی سطح پر برطانیہ کی اجارہ داری کو چیلنج کرنے کے لئے اٹھا اور اس نے مصر پر حملہ کر دیا۔ دو طاقتوں، برطانیہ اور فرانس میں منقسم دنیا نپولین کے فرانس کے زوال تک برقرار رہی اس کے بعد برطانیہ کی اجارہ داری قائم ہوگئی، جسے چیلنج کرنے والا کوئی نہیں تھا۔1815ء سے لے کر 1914ء تک برطانیہ برتر طاقت رہا۔ برطانیہ کے لئے سب سے بڑا چیلنج چھوٹی طاقتوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کا تھا۔

توازن کا چیلنج سب سے بڑا یورپ میں تھا اس کی عمومی کیفیت وہی تھی جو آج کل ہے۔ برطانیہ اور فرانس کو خدشہ ہے کہ طاقتور جرمنی، ان کے لئے چیلنج بن کر ابھر رہا ہے۔ خاص طور پر مغربی اور مشرقی جرمنی کے باہم متحد اور مدغم ہو جانے سے، اس دفعہ جرمنی کے اتحاد کو بڑی اقتصادی قوت بھی حاصل ہے۔ برطانیہ اور فرانس کی سفارت کاری کی سطح پر کوشش از سرِ نو منظّم روس کو جرمنی اور جرمنی کو روس سے توازن کا وسیلہ بنانے کی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ روس کو اس کی مشرقی یورپ حفاظتی پٹی سے محروم کرنا چاہیں گے اور روس کو بلقانی ریاستوں میں مزید اثر و نفوذ حاصل کرنے دیں گے۔ سربیا کی جارحیت کو تادیر برداشت کئے رکھا گیا اور اس کی جارحیت کا صلہ پچاس فیصد بوسنیا کی شکل میں دیا گیا، اور یوں روس کو اپنا اثر جرمنی کی سرحد کی طرف بڑھانے کی ضمانت دی گئی، ساتھ ہی چیک اور پولش سرحد کی جانب روس کے اثر کو محدود کر دیا گیا ہے۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، اس طرح کے فوجی جوڑ توڑ آگے چل کر بڑی جنگوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتے آئے ہیں۔ فوجی جوڑ توڑ کے نتیجے میں بالآخر ہمیں پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عالمگیر کا سامنا کرنا پڑا۔

یورپی سکالر1815ء سے1914ء تک کے جس عرصے کو ''طویل امن'' کہتے ہیں وہ دو جنگوں پر ختم ہوا۔ یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ طویل امن کے اس عرصے میں نوآبادیاتی توسیع اور سرمایہ دارانہ منڈی کے تحفظ کی ضمانت کے لئے تقریباً120 ملین افراد ہلاک کئے گئے۔

س: افریقہ میں نوآبادیات اور امپریلزم کے اثرات کا جائزہ لیجئے۔ روانڈا، برونڈی، زائرے اور دوسرے ملکوں کی حالت بہت پتلی ہے ان کا چلنا دشوار ہے۔

ج: یہ صورتحال مقابلتاً نئی ہے گذشتہ چھ برس کے دوران ہم نے ملکوں کی اس غیر معمولی صورتحال کا مشاہدہ کیا ہے کہ ان کی حکومتیں داخلی کمزوریوں کے باعث ختم ہو گئیں۔ انقلاب کے سبب سے نہیں۔ خانہ جنگی بھی ان کے خاتمے کا سبب نہیں بنی۔ پہلے صومالیہ گیا اس کے بعد روانڈا کی باری آئی۔ اب ہم زائر (کانگو) میں اسے ہوتا دیکھ رہے ہیں بڑے دلچسپ سوالات پیدا ہو رہے ہیں۔

پہلا سوال بعض ریاستوں کی، نوآبادیاتی نظام کے، بعد بقا کا ہے یہ ریاستیں نوآبادیاتی طاقتوں کی طرف سے انتظام چلانے کے مقصد سے، انتظامی سرحدیں قائم کرنے کے نتیجے میں وجود میں آئیں۔ جب نوآبادیاتی نظام ختم ہوا تو یہ انتظامی سرحدیں، ریاستی سرحدیں بن گئیں جو بین الاقوامی قانون کے تحت تسلیم کر لی گئیں۔ جب انتظامی سرحدیں ریاستی سرحدیں بنائی جاتی ہیں اور ایسا کرتے ہوئے دوسرے عوامل کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو عدم استحکام کے عناصر ازخود پیدا ہو جاتے ہیں، وہ کسی قسم کے قدرتی خطوط کی پابندی نہیں کرتے۔ ثقافتی، جغرافیائی یا زمینی عوامل میں سے کسی کو بھی ملحوظ نہیں رکھا جاتا یہی وجہ ہے کہ نو آبادیاتی نظام کے بعد کی اکثر ریاستیں بناوٹی ہیں۔

ایک دوسری صورت کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ سرد جنگ اور سرد جنگ کا آغاز ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔

1947ء میں جو دو ممالک نوآبادیاتی نظام کی گرفت سے آزاد ہوئے وہ پاکستان اور بھارت تھے۔ وہ سرد جنگ کے شروع ہونے کے دو سال بعد آزاد ہوئے۔ آخری ممالک جنہیں نوآبادیاتی گرفت سے آزادی ملی انگولا اور موزمبیق تھے۔ یہ 1974ء کا واقعہ ہے جب سرد جنگ اپنے عروج پر تھی۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں سُپر طاقتوں سوویت یونین اور امریکہ نے نوآبادیاتی نظام کی گرفت سے نکلنے والے ملکوں کو شطرنج کے مہرے جانا وہ ان پر قبضہ کرنا چاہتے تھے انہیں زیر اثر لانے کے لئے انہیں فوجی اور اقتصادی امداد کی پیش کش کی گئی۔ طے پایا کہ ان کا فوجی اور انتظامی ڈھانچہ استوار کیا جائے اور یہ کام بین الاقوامی ترقی اور فوجی امداد کے پروگرام کے توسط سے کیا جائے۔ چنانچہ یہ ریاستیں اسلحے اور سرمائے کے

مصنوعی انجکشنوں کے سہارے استوار کی گئیں۔ان ریاستوں نے فوجی اور اقتصادی اہمیت کے کئی مقاصد پورے کیئے۔انہیں اقتصادی رسائی فراہم کی۔اس عمل میں ان ملکوں کا امداد دینے والوں پر انحصار بڑھ گیا، اقتصادی اور فوجی امداد نے حکومتی ڈھانچے کے قیام کے لئے گوند کا کام کیا۔

سرد جنگ ختم ہو چکی ہے۔امداد اور فوجی تعمیر کا ڈھانچہ غائب ہوگیا ہے۔سرد جنگ کے بعد کے دور میں جن ریاستوں کی امریکہ کے لئے فوجی اہمیت نہیں تھی اور جو سوویت یونین کی امداد سے بھی محروم تھیں ختم ہونے لگیں۔

صومالیہ اس سلسلے کی ایک مکمل مثال ہے۔صومالیہ کے ڈکٹیٹر سعید برے پہلے سوویت یونین کے اتحادی تھے سوویت یونین نے اسے فوجی اور اقتصادی امداد دے کر طاقت مہیا کرنا چاہی۔سوویت یونین اقتصادی بحران کی گرفت میں آیا تو صومالیہ کی امداد میں کمی آنا شروع ہوگئی۔سعید برے نے امریکہ کی طرف رُخ کر لیا جسے خلیج فارس کے علاقے میں فوجی اثر پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔چنانچہ امریکہ نے سعید برے کا ساتھ دینا شروع کیا۔اُسے زیادہ امداد فراہم کی جانے لگی وہ اقتدار میں برقرار رہے۔سرد جنگ ختم ہوئی تو ان کی حمایت ترک کر دی گئی، ریاستی بحران شروع ہوگیا، گوند ختم ہوئی تو ریاستی ڈھانچہ بھی بکھرنے لگا۔

س: 1989ء میں آپ پہلی مرتبہ سوویت یونین گئے آپ اس سے پہلے وہاں کیوں نہیں گئے؟

ج: میں سوویت یونین کے کمیونزم کا ناقد رہا ہوں۔میرے خیال میں یہ بُری طرز کا اور سوشلسٹ سوسائٹی چلانے کا غلط طریقہ تھا۔اس موضوع پر میں نے جو مضامین لکھے اور تقریریں کیں ان کے باعث میں سوویت یونین کے کرتا دھرتاؤں کے نزدیک ناپسندیدہ شخص قرار پایا۔1989ء میں مجھے گلاسنوسٹ کے باعث رعایت ملی اور ماسکو یونیورسٹی نے مجھے چند لیکچر دینے کے لئے دعوت دی۔

س: اس دورے کا آپ پر خاصا اثر ہوا؟

ج: جی ہاں مثال کے طور پر میں نے یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ سوویت یونین کی ترقی کس درجہ پر غیر منظم ہے۔ایک ملک جس نے خلا سے متعلق نہایت جدید تحقیق کی ہے''جیٹ''لیزر، طبی ٹیکنالوجی کے باب میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اس کے بازار میں ایک چھوٹا سا کیلکولیٹر بھی نہیں۔سوویت سوسائٹی کے ایک حصے کا دوسرے حصے کے ساتھ کوئی طبعی ربط اور رشتہ

MashalBooks.org

نہیں۔ میرے خیال میں اس کی غیر طبعی ریاستی تعمیر اس کے خاتمے کا سبب بن گئی۔ تمام تر فوجی مصارف کی صورت میں جب عام شہری شعبے کے لئے کچھ بھی نہ بچتا ہو، ہر چیز ضائع کرنے کے مترادف ہے امریکہ میں بھی فوجی تحقیق اور ترقی اور سویلین ٹیکنالوجی اور شہری منڈی میں بڑی حد تک توازن کے باوجود ملک کو نقصان پہنچا ہے وہاں (سوویت یونین میں) یہ صورت بھی نہیں تھی وہاں ریاستی ڈھانچہ برقرار نہ رہ سکا۔

س: کیا آپ کو حیرت ہوئی تھی؟

ج: مجھے مختلف شعبوں میں تال میل نہ ہونے پر حیرت ہوئی تھی، اصل حیرت اس کی وسعت پر اور لوگوں پر اس کے مایوس کن اثرات پر ہوئی۔1989ء میں نوجوان پود کا مستقبل پر کوئی یقین نہیں تھا، مستقبل پر یقین کے فقدان کا ریاستی ڈھانچے کے گرانے میں عمل دخل تھا۔

س: سوویت یونین کے خاتمے کی اصل محرک شخصیت میخائل گورباچوف کی تھی آپ کا ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ج: یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ آیا وہ جانتے تھے کہ وہ کیا کررہے ہیں؟ وہ ایک خیال پرست اور ذہین شخص تھے لیکن وہ یہ کیوں نہ سمجھ سکے کہ وہ جس عمل اور طریق کا آغاز کررہے ہیں وہ بہت تیز ہے اسے موجودہ نظام برداشت نہیں کرسکے گا۔ میری الگزینڈریا کوولیف سے بات ہوئی وہ سوویت یونین کے پولیٹکل بیورو میں دوسرے نمبر پر تھے، انہی کو پریستوریکا گلاسنوسٹ کا خالق سمجھا جاتا ہے وہ بے حد ذہین انسان تھے۔ جن دنوں میں پرنسٹن یونیورسٹی میں تھا وہ کولمبیا میں تعلیم پارہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ صورت حال بگڑ سکتی ہے اور شیرازہ بکھر سکتا ہے۔ حالات کا رُخ اس جانب تھا۔

جہاں تک مغرب کا تعلق ہے وہ تو یہی چاہتے ہیں کہ چین بھی وہی کچھ کرے جو سوویت یونین نے کیا تھا۔ چینی بڑے منظم انداز میں معاشرتی تبدیلی لانے میں مصروف ہیں مجھے اُمید ہے کہ وہ کر پائیں گے۔ چین کا شیرازہ بکھرا تو اس کے اثرات ایشیا پر طویل عرصے تک رہیں گے۔ اس سے عدم استحکام پیدا ہوگا۔ چین ایک مشکل راستے پر گامزن ہے۔ اس کی ترقی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ کوئی بھی نظام اسے بمشکل برداشت کرسکتا ہے۔ ساحلی علاقوں میں چین کی سالانہ اقتصادی ترقی 25 فیصد کے لگ بھگ ہے ملک میں مجموعی طور پر یہ 13 فیصد ہے۔ تاریخ میں ترقی کی یہ سب سے بڑی شرح ہے یہ فروغ پذیر ہے بعض

MashalBooks.org

پابندیوں کے بغیر اتنی ترقی حاصل نہیں کی جاسکتی۔

س: سوویت یونین کے خاتمے کا پاکستان پر کیا اثر ہوا ہے؟

ج: ماؤ کے ماننے والے اور ماسکو نواز دونوں طرح کی کمیونسٹ پارٹیاں ختم ہوگئی ہیں۔ میرے خیال میں اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا اور اس کا مطیع بننا ہرگز اچھا نہیں۔ اب بورژوازی جو ریاست پر کنٹرول کرتی ہے واشنگٹن، عالمی بنک اور آئی ایم ایف پر زیادہ انحصار کرنے لگی ہے۔ لیکن آزاد بائیں بازو کی حیثیت میں آزاد چیلنج کرنے والوں کے اُبھرنے اور منظر پر آنے کے امکانات ضرور موجود ہیں۔

س: امریکہ یورپ اور دوسرے جگہوں کے بائیں بازو کا سوویت یونین سے گہرا سیاسی اور جذباتی لگاؤ تھا، کیا آپ کے نزدیک یہ غلطی تھی؟

ج: یہ محض غلطی نہیں تباہی تھی۔ یہ ہر حال میں فرد یا گروپ کے لئے جو کسی فرد پر انحصار کرتا ہے تباہی کا موجب ہے اور یہاں تو معاملہ ایسی ریاست کا تھا جو اس درجہ ناقص تھی اور سوویت کمیونزم اپنی ساخت میں اس قدر ناقص تھا کہ اس سے بدتر شکل شاید ہی بنی نوع انسان نے دیکھی ہو۔

امریکی لیفٹ کا مستقبل

س: امریکہ میں لیفٹ کے مستقبل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: میں نہیں کہہ سکتا کہ لیفٹ کا مستقبل کیا ہے لیکن امریکہ میں روشن خیالی کا مستقبل غیر لیفٹ صورتوں میں موجود ہے جیفرسونین لبرل ازم کا لیفٹ کی نسبت کہیں زیادہ روشن مستقبل ہے۔ امریکی روایت میں ایک طرح کی انارکی کی جڑیں خاصی گہری ہیں۔ حکومت کے بارے میں حقیقی شبہات، طاقت کی مرکزیت کے بارے میں حقیقی اعتراض اسی انارکی کے مظہر ہیں۔ روایتی اور متشدد مارکسسٹ لیفٹ کے مقابلے میں انارکزم کا کہیں زیادہ بہتر مستقبل ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہاں آج جو صورتحال ہے وہ ہمیشہ نہیں رہے گی۔ امریکہ اپنے وسائل، معاملات اور آبادی کے اعتبار سے تیس برس پہلے کی نسبت آج یکسر مختلف ہے۔ کل آبادی کی بڑی شرح غالباً ایک چوتھائی غیر سفید فام ہے ان میں سے اکثر ملک کے باہر سے آئے ہیں یہ پہلی خاموش نسل ہے جب دوسری نسل آئی تو اس کے نئے مطالبے ہوں گے وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر امریکی سمجھے گی نئے مطالبات کرتے ہوئے

MashalBooks.org

اُسے فاصل ہونے کا احساس ہوگا۔

دوسرے عدم مساوات یا نابرابری کی صورتوں میں اضافہ ہونے لگا ہے تیس برس پہلے میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ ملک معاشرے کے نچلے طبقے کے تعلق میں اتنا غیر مساوی اور غیر منصف دکھائی دے گا۔ تقریباً 20 فیصد امریکی 45 فیصد آمدنی کماتے ہیں 4 فیصد افراد 85 سے 90 فیصد سے سٹاکس اور بانڈز کے مالک ہیں۔ یہ غیر مساوی صورتحال لوگوں کے اندازِ فکر پر اثر انداز ہوگی وہ تبدیلی آنے کا وعدہ پورا ہوتا نہیں دیکھیں گے تو ان میں غصہ پیدا ہوگا۔

س: لیکن کیا یہ سیاسی معیشت کے مالکوں اور منتظموں کے طبقے کے مفاد میں نہیں کہ وہ سیاسی استحکام کی ضمانت حاصل کرنے کی خاطر عوام کے لئے کم سے کم سرمائے اور آمدنی کی فراہمی کا اہتمام کریں؟

ج: نئی تدبیر(New Deal)اس کے بارے میں ہی تھی۔ یہ کوئی سوشلسٹ طرز کی نہیں تھی فرنیکلن ڈی روز ویلٹ بہترین سرمایہ دار تھے انہوں نے باور کر لیا تھا کہ کم سے کم سلامتی اور استحکام کے لئے انصاف کی فراہمی اور عوام کو اُمید دلائے رکھنا لازم ہے۔ امریکہ کے موجودہ حکمران اس سبق کو فراموش کر رہے ہیں وہ ملک میں ایک طرح کی افراتفری پھیلانا چاہتے ہیں۔

س: حالات مکمل طور پر جامد اور ساکت نہیں رہتے جس کی مثال آپ کے سامنے ہے۔

ج: تبدیلی آتی ہے اور جب آتی ہے تو بڑی تیزی سے آتی ہے میں جب طالب علم کی حیثیت سے امریکہ آیا تو یہ ملک نسل پرستی کی گرفت میں تھا جنوب میں قتل وغارت گری جاری تھی۔ مین ایک جاپانی اور برازیلین دوست کے ساتھ ممفس گیا تو چار گھنٹوں تک ہمیں کوئی ہوٹل نہ ملا کیونکہ ہم رنگدار تھے ایک زرد تھا ایک بھورا تھا اور ایک کالا تھا، آخر ہمیں ایک باڑے میں شب بسری کے لئے جگہ مل گئی۔ دو برس بعد لنچ کاؤنٹروں اور ہوٹلوں میں رنگ اور نسل کا امتیاز ختم ہو رہا تھا۔ دس برس بعد میں ممفس گیا اور شیرٹن ہوٹل میں ٹھہرا۔ میں جب وہاں پہنچا اور ٹیکسی سے اترا تو جس لڑکے نے میرا سامان اٹھایا وہ سفید فام تھا۔ میں اتنا خوش ہوا کہ اُسے دس ڈالر ٹپ کے طور پر دے دیئے حالانکہ مجھ میں اتنی استطاعت نہیں تھی۔ وہ لڑکا میرا سامان کمرے میں رکھ کر گیا تو میں بیٹھ کر رونے لگا۔ یہ بہت بڑی تبدیلی تھی یہ تبدیلی

لانے کے لئے بڑی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ ہمیں ابھی بہت کچھ کرنا ہے لیکن تبدیلی آ چکی ہے۔

1964ء میں جب ٹونکن گلف قرارداد منظور ہوئی اور جانس انتظامیہ نے شمال میں بمباری کرکے ویت نام کی جنگ کو وسعت دے دی تو ایلے نوائے یونیورسٹی میں ہم نے ملک میں پہلی مرتبہ احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے150 افراد ایک چھوٹے سے ہال میں جمع کیے، ہمیں ڈر تھا کہ شاید دس افراد بھی جمع نہ ہو پائیں گے بہرحال ہم پر ہلہ بول دیا گیا ہمیں دوسرے ہال میں جانا پڑا۔ تاہم جنگ کے خلاف تحریک شروع ہوگئی تھی ہم نہیں جانتے تھے کہ یہ ہوسکے گی۔ سوشل تحریکوں کے بارے میں پیش گوئی کرنا ہمیشہ مشکل رہا ہے کوئی سکالر انقلاب یا اتھل پتھل کی پیش بینی نہیں کرسکا اور نہ اس مقصد سے کوئی فارمولا تلاش کرسکا ہے۔

س: آپ اپنی سیاست کی کیا تشریح کریں گے؟

ج: سوشلزم اور جمہوریت مجھے دونوں سے دلی لگاؤ رہا ہے۔ جمہوریت سے مراد مساوات، اجتماع کی آزادی، ناقدانہ فکر ونظر اور حکمرانوں کا عوام کی جانب سے محاسبہ ہے۔ سوشلزم سے مراد دولت پر ریاست یا کارپوریشنوں کا نہیں بلکہ عوام کا قبضہ ہو۔

س: آپ نے غیر معمولی طور پر طویل فاصلوں کا جسمانی لحاظ سے بھی سفر کیا ہے اور فکری اعتبار سے بھی، آپ بہار کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے ہجرت کرکے پاکستان آئے، امریکہ کی پرنسٹن یونیورسٹی میں تعلیم پائی اس کے بعد انقلاب پسند الجزائیر میں کام کیا واپس امریکہ آئے جنگ مخالف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ کا یہاں تعلیم وتدریس کے سلسلے میں کیریئر تھا اب آپ پاکستان میں متبادل تعلیمی ادارہ قائم کرنے کے لئے کوشاں ہیں اس طویل اور متنوع سفر کے ضمن میں آپ کے خیالات اور یادیں کیا ہیں؟

ج: میری پسندیدگیاں کیا تھیں؟ بنیادی طور پر دو تھیں۔ بچپن یا کالج کے دنوں کے میرے تمام دوستوں کی یہی پسندیدگیاں ہوسکتی تھیں میں ان کے بارے میں غور کرتا ہوں تو مجھے کوئی تاسف نہیں ہوتا۔ میری پسند مستقل استاد یا کسی کارپوریشن کا ایگزیکٹو بننے کی تھی تاکہ بڑی آرام دہ بورنگ، لالچی، خاموش زندگی بسر کرسکتا لیکن اس کے برعکس میں نے جس طرح زندگی بسر کی ہے وہ روحانی اور علمی اعتبار سے نہایت آسودہ۔ لیکن مادی لحاظ سے نہایت

غریبانہ ہے، کلکتہ سے کاسابلانکا تک اور الجزائر سے سان فرانسسکو تک میرے بے شمار دوست ہیں۔ میرے لئے یہ بات اطمینان بخش ہے کہ میں نے جو کچھ کیا سوچ سمجھ کر کیا کسر نہیں اٹھا رکھی۔ یہ الگ بات ہے کہ میں ہر دفعہ کامیاب نہیں ہوا لیکن جہاں تبدیلی ضروری سمجھی وہاں تبدیلی کے لئے کوشش ضرور کی، میں نے کارل مارکس کی یہ بات ہمیشہ ملحوظ رکھی کہ علم کی اصل غایت یہ ہے کہ چیزوں کو سمجھو تا کہ انہیں تبدیل کر سکو۔

س: آپ اپنے طلباء کو کیا بتاتے ہیں؟

ج: میں انہیں کچھ نہیں بتاتا، میرا خیال ہے کہ میری زندگی اور میری تعلیم کے دو مقاصد ہیں۔ ناقدانہ تفکر کرو اور خطرے مول لو۔

حوالے

1۔ جگ پردیش چندر کی تالیف Tagore and Gandhi Argue (لاہور 1945ء) مزید دیکھئے بی کے اہلووالیہ کی Tagore Gandhi Controversy (نئی دہلی پنچ پبلی کیشنز 1981ء)

2۔ رابندر ناتھ ٹیگور The Home and the World اور ستیہ جیت رائے کی فلم اسی نام سے 1984ء

3۔ لیری کولنز اور ڈومنیک لاپیر Freedom at Midnight (نیویارک سائمن اینڈ شسٹر 1975ء) فلم گاندھی۔ رچرڈ ایٹن برا 1982ء)

4۔ سٹینلے والپرٹ Jinnah of Pakistan (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس 1984ء)

5۔ Stories my country told me (ایچ اونز رتھ بی بی سی 1996ء)

6۔ دیکھئے ارون پی ایل ہانس From War to Water pact

7۔ دیکھئے ٹامس بینگٹن میکالے Selected Writings (شکاگو پریس 1972ء)

8۔ پامیلا کوسے A New University for Pakistan

9۔ فرانز فینن The Wretched of the Earth (گروپریس 1968ء)

10۔ فرانز فینن A Dying Colonialism (لندن 1980ء)

11۔ فرانز فینن Black Skin, White Mask (نیویارک 1968ء)

12۔ فرانز فینن Towards the African Revolution (نیویارک 1969ء)

MashalBooks.org

13۔ نوم چومسکی "The Responsibility of Intellectuals" نیویارک ریویو آف بکس فروری 1967ء

14۔ اقبال احمد "Revolutionary Warfare: How to tell when the Rebels have Won".

15۔ ایڈورڈ سعید "The Arab Portrayed" 1967

16۔ اقبال احمد ایڈورڈ سعید کی کتاب کا دیباچہ "The Pen and the Sword"

17۔ ایڈورڈ سعید "The Question of Palestine" 1979

18۔ ایڈورڈ سعید "The Question of Palestine"

19۔ ایڈورڈ سعید The Mind of Winter

20۔ ایڈورڈ سعید Culture and Imperialism 1983

21۔ ہاورڈ بلوم The Lucifer Principle 1995

22۔ رنجیت گوہا A Subaltern Studies Reader 1997

23۔ محمد عبدالجابری Arab Islamic Philosophy 1999

24۔ نوم چومسکی The Washington Connection and the Third World Fascism.

25۔ نوم چومسکی Fateful Triangle 1999

MashalBooks.org

اقبال احمد اور ڈیوڈ برسیمین بولڈر کولوریڈو امریکہ میں ۔ اکتوبر 1998 ۔ (فوٹو وار بن حامد)

اقبال احمد ہیرس برگ پنسلوینیا میں
1972 (فوٹو ڈیوڈ مارٹن)

MashalBooks.org

اقبال احمد اندرا گاندھی کے ساتھ دہلی میں ۔ 1979

اقبال احمد یاسر عرفات کے ساتھ

MashalBooks.org

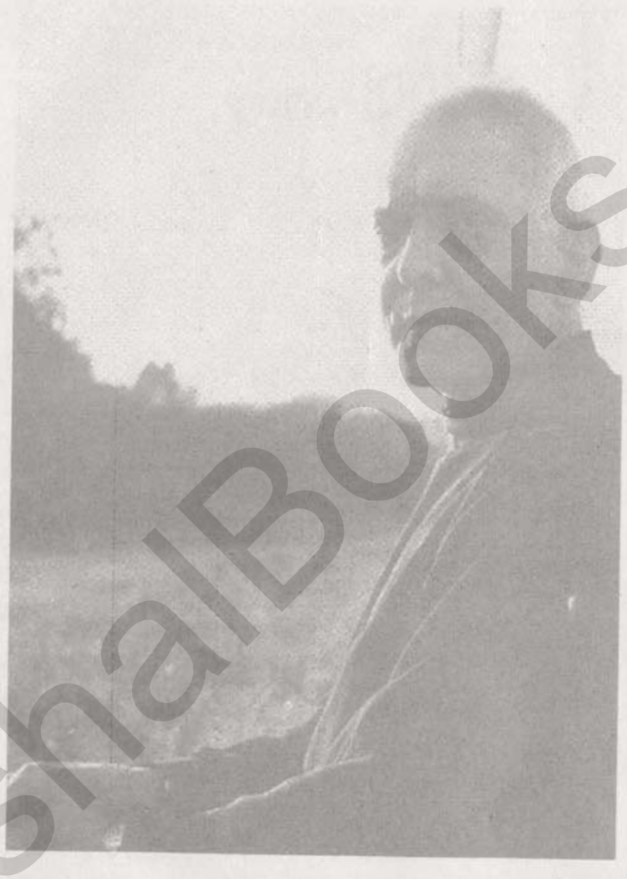

اقبال احمد ہمشائر کالج میں

MashalBooks.org

باب دوم

مسخ شدہ تاریخ

نیشنلزم کے خطرے

س: مارچ 1998ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) ہندوستان میں اقتدار میں آئی، اس کی سیاست کیا ہے؟

ج: پہلی بات یہ ہے کہ وہ اقلیت کی مخالف ہے وہ ہندوستان کو جو ہزاروں برس سے کثیر الثقافت، کثیر المذاہب اور کثیر الوجود رہا ہے ''ہندوتوا'' کی صورت میں واحد ہندو سوسائٹی بنانا چاہتی ہے۔ ہندوستان کے بارے میں اگر آپ یہی نقطۂ نظر اپنالیں تو پھر کئی باتیں سامنے آئیں گی۔ وہ ہندوستان کی اس تاریخ سے جو ان کے نقطۂ نظر سے خصوصی طور پر ہندو نہیں ہے نفرت کرتے ہیں۔ ہندوستان کے تاریخ کا ایک بودھ دور ہے ہندوستان کی تاریخ کا سات سو برس کا مسلم دور ہے اور اس میں کم تر درجے میں ہندوستان کی تاریخ کا نوآبادیاتی دور بھی شامل ہے۔ اس اعتبار سے بی جے پی کی تحریک تاریخ دشمن تحریک ہے۔ بی جے پی نے دسمبر 1992ء میں سولہویں صدی کی بابری مسجد کو جو تباہ کیا وہ اس کے تاریخ دشمن نقطۂ نظر کا ظہار تھا (1)۔ بی جے پی کی سیاست کا ایک دوسرا پہلو ہے۔ یہ اقلیتوں کی مخالفت کا پہلو ہے۔ ہندوستان میں سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کی ہے جو کل آبادی کا 15 فیصد ہیں ان کے بعد سکھ عیسائی اور بودھ آتے ہیں۔ وہ تمام ڈر محسوس کررہے ہیں کہ ہندوستان کو غیر ہندو عناصر سے پاک کرنے کی مہم میں بی جے پی انتہائی زیادتیوں کی مرتکب ہوگی۔ بابری مسجد کے گرانے سے پہلے ہندوستان کی تاریخ میں فرقہ پرستی کی بے

MashalBooks.org

مثالی کیفیت کو ہوا دی گئی مسجد کی شہادت کے بعد خون ریز فسادات اور مسلمانوں کے قتل کا سلسلہ شروع ہو گیا یعنی بمبئی مغربی ہندوستان، بہار اور مشرقی ہندوستان میں فسادات کا بہت زور رہا اس سے خوف اور اقلیت دشمنی کا رویہ پیدا ہوا، لیکن خوش قسمتی سے اس درجے تک نہیں پہنچا اور نہ پہنچ پائے گا جس درجے پر یورپ میں یہودیوں کے خلاف فسطائی مہم کی صورت میں یا سابق یوگوسلاویہ میں مسلمانوں کے خلاف سربوں کی مہم کی شکل میں پہنچا۔

بی جے پی کی سیاست کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس نے ہندوستان کی مختلف تاریخ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا ہے۔ اس طرح کی سوچ رکھنے والے لوگ اقتدار میں ہوں تو وہ مختلف تاریخ بنانے کے درپے ہو جاتے ہیں اور پرانی تاریخ کو تباہ کرنے لگتے ہیں۔ ہم نے صیہونی تحریک دیکھی ہے جس نے فلسطین کی مختلف تاریخ بنانے کی کوششوں کا آغاز کیا اور مغربی دنیا میں وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئی۔ انیسویں صدی کی نسل پرستی کی تحریکیں مختلف تاریخ بنانے کی کوشش کرتی آئی ہیں۔ مثال کے طور پر استنبول کے شہر کو مغرب کی تخلیق بتایا گیا حتیٰ کہ تاج محل کے بارے میں کہا گیا کہ یہ اطالوی آرٹسٹوں نے تعمیر کیا۔ مقصد یہ ہے کہ تاریخ کو تباہ کریں اور نئی تاریخ بنا لیں۔

منجملہ دوسری باتوں کے مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی بحیثیت ملک کے فوجی طاقت میں اضافہ کیا جائے گا۔ ہندوستان جب سے نو آبادیاتی چنگل سے نکلا ہے اسے تشدد اور عدم تشدد کی مختلف سمتوں میں کھینچا جاتا رہا ہے، گاندھی اور بال گنگا دھر تلک کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ آج ہندوستان میں جو تحریک چل رہی ہے وہ ایک خاص مہم ہے۔ لیکن وہ آخری نہیں ہے آج کل ہندوستان میں قوم پرستی کے حامی ان عناصر نے اقتدار حاصل کر رکھا ہے جو اس ملک کو فوجی طاقت بنانا چاہتے ہیں۔

س: بی بی سی کی دستاویزی فلم ''کہانیاں جو میرے ملک نے مجھے سنائیں'' کے تعارف میں آپ نے بتایا ہے کہ کس طرح تاریخی سچائیوں اور غیر سچائیوں کو نیشنلزم نے باہم گڈمڈ کر دیا ہے جب آپ اجتماعی محسوسات کو اختلاف کی اساس پر مرتب کرتے ہیں تو اس سے انتہا پسندی اور نفرتیں پیدا ہوتی ہیں۔ (2)

ج: ایسا ہوتا رہا ہے میں ایسی نیشنلسٹ نظریوں کا ذکر کر رہا تھا جو بالعموم اس طرح کے رجحانات رکھتے ہیں ہماری کوئی استثنائی حیثیت نہیں ہے فرق یہ ہے کہ اس کو دو طرف سے کھینچا جا رہا

ہے۔ بی جے پی کے اتحادی بی جے پی سے زیادہ برے ہیں وہ اسے مزید انتہاؤں کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ وشواہندو پریشد، شیوسینا اور سب سے اہم راشٹریہ سیوک سنگھ جو بی جے پی کی سرپرست اور دراصل فسطائی تنظیم ہے یہ سب مل کر ہندوستان کی دوسری بڑی پارٹی کو اختلاف کے نظریے کی انتہاؤں کی جانب دھکیل رہی ہیں۔ ہندو مسلمانوں سے مختلف ہیں۔ عیسائی ہندوؤں سے مختلف ہیں۔ سکھ تمام سے مختلف ہیں۔ اس سے انتہا پسندی پیدا ہو رہی ہے اس انتہا پسندی سے ایک تاریخی مسجد کی تباہی یا فرقہ وارانہ فسادات کے ضمن میں مظالم جیسی زیادتیاں پیدا ہوتی ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کا مختلف جگہوں پر پھوٹ پڑتا اسی ذیل میں آتا ہے۔ فوجی طاقت میں اضافہ کرنے کا رجحان ہی راجستھان کے صحرا میں پوکھران کے مقام پر دوسرے ایٹمی تجربے کا سبب بنا۔ اختلافات کا نظریہ فوجی طاقت بڑھاتے چلے جانے کا محرک ثابت ہوتا ہے، اور مقامی طور پر تشدد اور عالمی سطح پر جنگوں کا سبب بنتا ہے۔

س: آپ نے دستاویزی فلم میں کہا ہے کہ نیشنلزم پھیلے ہوئے اور منجمد تشخص کا نظریہ ہے، اگر تاریخ کی بنیاد پر اجتماعی تشخص قائم کرنا مقصود ہے تو پھر آپ کو تاریخ مسخ کرنا پڑے گی۔

ج: نہ صرف اجتماعی تشخص، کی تشکیل بلکہ ''اپنے مخالف'' یا دوسرے سے مختلف ہونے کی بنیاد پر تشکیل، ہم فلاں اور فلاں ہیں، اور دوسرے وہ نہیں ہیں، یعنی ہم اس لئے ایسے ہیں کیوں کہ ہم مغرب سے، مسلمانوں سے، ہندوؤں سے، یہودیوں سے، یا عیسائیوں سے مختلف ہیں۔ اس سے انتہائی نوعیت کی مسخ صورتیں پیدا ہوتی ہیں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں مسلم مغل حکومت کو جس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اصل میں وہ دیسی نہیں تھی۔ مورخ تو کہتے ہیں کہ مغل سلطنت کے جاگیردار اور اشرافیہ مسلمان نہیں ہندو تھے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان سات سو سالہ مسلم دورِ حکمرانی میں ہندوؤں کے مقابلے میں غریب ہی رہے۔ ہندوؤں میں زیادہ تر جائیدادوں کے مالک تھے۔ مسلمانوں میں اکثریت ان اچھوتوں کی تھی جنہوں نے آزادی اور مساوات حاصل کرنے کی غرض سے اسلام قبول کرلیا۔ اسلام میں ذات پات بھی نہیں چنانچہ ہر روز حقائق کو مسخ کیا جا رہا ہے۔

لیکن یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اکثر معروف ہندوستانی مؤرخین ان غلط مفروضوں کی نفی بھی

MashalBooks.org

کررہے ہیں۔ بالکل نئے یہودی مورخین کی طرح جنہیں نام نہاد اصلاح پسند کہا جاتا ہے اس ایجاد کردہ تاریخ کا جواب دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ صیہونیت، مشرق وسطیٰ پر نافذ کی گئی ہے، یہ اصلاح پسند مؤرخ سب کے سب یہودی ہیں، وہ نیشنلسٹ نظریے کی بگڑی ہوئی شکل کو درست کرنے کے سلسلے میں قابل قدر کام کررہے ہیں۔ (3) یورپی فسطائیت کے سخت متشدد دور میں ایسا نہیں کیا گیا۔ یورپی فسطائیت کے خلاف اصلاح پسندانہ دلائل وبراہین فسطائیت کے مخالفین کی طرف سے پیش ہوئے اور وہ بھی جنگ کے بعد کے زمانے میں، اس کے اندر سے پیدا نہیں ہوئے ہندوستان، پاکستان اور اسرائیل کے بارے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ نیشنلزم کی مسخ شدہ صورت کو مؤرخین کی نئی نسل نے پہچانا اور تسلیم بھی کیا ہے اور اصلاح کے لئے تشریحات بھی پیش کی ہیں۔

س: ان تین معاشروں میں باہم سخت اختلاف ہے اور ان کے اندر بھی کئی اختلافات ہیں۔

ج: بڑی حد تک، ہندوستان اور پاکستان کی حد تک خصوصی طور پر صحیح ہے۔ اسرائیل کے بارے میں تو قطعی طور پر صحیح ہے۔ ایڈورڈ سعید اس سے بہت متاثر ہوئے ہیں اور میرا خیال ہے کہ اسرائیل کے تازہ دوروں کے بعد اسرائیلی اور فلسطین کے اختلاف کے بارے میں ان کی رائے میں قدرے تبدیلی آئی ہے۔ (4) انہوں نے اسرائیلی دانشوروں کی جانب سے اس حقیقت کا اعتراف کیا جانا محسوس کیا ہے کہ صیہونی نظریے نے تاریخ کے بارے میں ادراک اور تصورات کو مسخ کیا ہے اور مستقبل اور ماضی کے بارے میں رویوں کو بھی بگاڑا ہے۔ ہم عام لوگوں کی طرح نارمل زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں غلطیوں کی اصلاح کرنا ہوگی۔ نظریہ سازوں کی نئی کھیپ نے جس طرح ہندوستان میں بی جے پی کے وطن پرستوں، اسرائیل میں دائیں بازو کے صیہونیوں اور پاکستان میں مسلم نیشنلسٹوں نے اپنے عوام سے ان کی اصل تاریخ چھین کر انہیں گہرا نقصان پہنچایا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ چوری، ڈکیتی اور جبر وتشدد ہے جسے برداشت نہیں کیا جانا چاہیے تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ مسخ شدہ تاریخ کے ہر جگہ ناقد موجود ہیں بالآخر ان کا اثر ہوکر رہے گا۔

یہاں امریکہ میں بھی نوم چومسکی کی آواز ذرائع ابلاغ اور طاقت کے اداروں نے برملا دبادی ہے۔ وہ ایک ممتاز دانشور ہیں ایڈورڈ سعید بھی انہی جیسے ہیں دونوں کو امریکی اخبارات میں نہیں چھاپا جاتا۔ وہ ان لوگوں میں سے بھی نہیں ہیں جو امریکی ٹیلیویژن پر

پنڈت بن کر آتے ہیں۔اس کے باوجود وہ جہاں بھی تقریر کرتے ہیں انہیں سننے کے لئے نوجوانوں کے ہجوم کھنچے چلے آتے ہیں ان کی کتابیں شوق سے پڑھی جاتی ہیں وہ کسی جماعت کے رکن نہیں تاہم وہ مستقبل سے گفتگو کرتے ہیں۔

بعض خبریں جو شائع ہونے کے قابل ہیں

س: پہلے آپ نیویارک ٹائمز کے لئے اکثر لکھتے تھے لیکن اب برسوں گزر گئے ہیں آپ کا کوئی مضمون نہیں چھپا اس کا کیا سبب ہے؟

ج: اسے ستم ظریفی ہی سمجھئے۔1978ء سے1980ء تک نیویارک ٹائمز مجھے اکثر چھاپتا رہا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اے ایم روزنتھال (دائیں بازو کے صیہونی) اس کے ایڈیٹر تھے۔ مجھے پر اور سعید پر پابندی اس وقت لگی جب اخبار کی ادارت جوزف لیلیٰ ویلڈ کے پاس آئی وہ آزاد خیال صیہونی تھے میرے خیال میں ایڈیٹر کا تبادلہ اس کا محرک ہوا ہوگا۔ روزنتھال دائیں بازو کے صیہونی تھے اس لئے انہوں نے غالباً سوچا ہوگا کہ اگر وہ مجھے اور سعید کو چھاپیں گے تو ان پر تعصب کا الزام نہیں لگایا جائے گا۔

ایک دوسری وجہ بلکہ میرے خیال میں بڑی وجہ یہ تھی کہ اس ملک (امریکہ) کے ماحول میں دائیں جانب بہت گہرا جھکاؤ آ گیا۔ یہ تبدیلی اس غیر معمولی صورتحال کا اظہار کرتی ہے کہ ڈیموکریٹک پارٹی کا دوبارہ منتخب ہونے والا صدر، نیوڈیل کے ثمرات کو موثر طور پر ختم کر سکتا ہے اور اپنی تمام تر خامیوں، کذب بیانیوں اور وقار کے رویوں کے باوجود لائق تعریف سمجھا جاتا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ روشن خیال ڈیموکریٹک انتظامیہ بشمول ذرائع ابلاغ زیادہ تر کلنٹن کے حق میں رہے ہیں۔اس اعتراف کے دو دن بعد کہ اس نے دروغ گوئی کی تھی اور اوول آفس میں ایک اکیس سالہ خاتون سے جنسی تعلقات قائم کرنے کے بارے میں جھوٹ بولا تھا، اس نے افغانستان اور سوڈان پر فوجی حملہ کیا اور وہ اس طرح کہ اس کا کوئی جواز بھی پیش نہیں کیا۔ وہ کسی جائز وجہ کے بغیر یک طرفہ کاروائی میں مصروف تھا۔اور نیویارک ٹائمز سمیت تمام اخبارات یہ کہہ رہے تھے کہ وہ امریکہ کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔(6) اس ماحول میں اختلاف رائے کو برداشت نہ کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا، ویت نام کی جنگ اور شہری حقوق کی تحریک کے دوران اختلاف رائے کی جو حدود پامال ہوئیں۔اور توڑی گئیں وہ پھر سے استوار ہونے لگیں ان

دیواروں کوتوڑنے سے بھی ہم معاشرے میں نمایاں ہوئے تھے۔اب یہ حدود پھر سے قائم ہوگئی ہیں اور ہم ان حدوں کی دوسری طرف ہیں یہ روزنتھال اور لیلیٰ ویلڈ سے زیادہ اہم مسئلہ ہے۔

امریکہ میں فکرودانش مجموعی طور پر، اور سوشل دانش خصوصی طور پر حملے کی زد میں ہے۔ سائنس دان جو چاہے کررہے ہیں لیکن عمرانی دانشور معتوب ہیں۔ بیشتر کئی انقلابی نوعیت کا مواد شائع نہیں کررہے ہیں۔ ذرائع ابلاغ غیر معمولی طور پر لاطینی گفتگو سے بھرے ہوئے ہیں۔ لوگ ٹیلویژن اور ریڈیو کے گرد بیٹھ کر بزرجمہروں کی طرح اسلام، چین، جاپان، ہندوستان اور عربوں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی جنہیں میں جانتا ہوں ان جگہوں اور ملکوں کی زبان نہیں جانتا جن کے بارے میں وہ لاف زنی کرتے ہیں۔ وہ ہماری تاریخ کے پانچ اہم واقعات بیان نہیں کرسکتے اور نہ کسی تحریک کی اساس کے بارے میں کچھ بتاسکتے ہیں۔ہم ایک ایسے وقت باتیں کررہے ہیں جب اسامہ بن لادن کوخبروں میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور امریکہ میں سب سے اہم موضوع بحث یا موضوع سخن بنا ہوا ہے۔آج تک کسی نے اس بات کا جائزہ نہیں لیا کہ اسامہ پیدا کس نے کیا ہے۔اس قسم کے اشارے بھی ہیں کہ اسامہ بن لادن سی آئی اے سے مل کر کام کرتا رہا ہے۔ اسے تشدد کا اولین تجربہ اس وقت ہوا، جب اُسے سوویت یونین کے خلاف لڑنے کے لئے افغانستان لایا گیا۔اس طرح کے بھی اشارے ہیں کہ سی آئی اے نے ہی اُسے جہاد پر آمادہ اور جہاد میں شریک کیا۔امریکہ اور سعودی عرب اس کی مالی امداد کرتے رہے۔صرف یہ کافی نہیں ہے۔کسی نے یہ نہیں بتایا کہ اسامہ بن لادن کے ملک، سعودی عرب کو مغربی کارپوریشنوں اور مغربی طاقتوں نے کس طرح لوٹا۔کسی نے یہ بھی نشان دہی نہیں کہ کہ اسامہ بن لادن جب وہاں تھا تو انہوں نے سعودی عرب میں کیا دیکھا ہے۔سعودی شہزادوں کے ایک ہی خاندان کی اس ریاست نے تیل کے وسائل (جو عرب عوام کے ہیں) مغرب اور سرمایہ کار فرموں کے حوالے کردیئے ہیں۔ اسامہ نے اپنے ملک کو لُٹتا ہوا دیکھا اس اسارے عرصے میں اس کے لئے صرف ایک تسلی اور تشفی تھی کہ اس کے ملک پر کسی کا قبضہ نہیں تھا اس کے ملک میں امریکی، فرانسیسی یا برطانوی فوجیں نہیں تھیں لیکن 1990ء کے اوائل میں اس نے دیکھا کہ یہ چھوٹی سی خوشی بھی اُس سے چھین لی گئی

MashalBooks.org

ہے۔سی آئی اے نے اس سے تعلق قائم کیا، امریکیوں نے اُسے مسلح کیا اس کی ٹریننگ کی اور آخر کار احساس دلایا کہ جب کوئی غیر ملکی تمہاری سرزمین میں آتا ہے تو تم متشدد ہو جاتے ہو اور تم لڑتے ہو۔ افغانستان میں جہاد کی یہی بنیاد تھی۔ آج جہاد بین الاقوامی مسلح جدوجہد کی ایک صورت ہے جو گذشتہ پانچ صدیوں میں کہیں بھی نہیں تھی۔ یہ ان پان اسلام ازم امریکیوں کی کوششوں سے وجود میں آیا ہے۔(7)

قبائل کو پرچم پکڑا دیئے گئے

س: آپ کے جواب میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو مختلف موضوعات کی طرف راغب کرتی ہیں۔ میں صرف ایک مسئلہ لیتا ہوں اور اخبار ''انڈی پنڈنٹ'' میں رابرٹ فسک کی اس تحریر کا ذکر کرتا ہوں جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ''ایک ایسی سرزمین میں جو اسلام کا گھر ہے، اور جہاں مکہ اور مدینہ میں اس کے مقدس ترین معبد ہیں امریکیوں کی مسلسل فوجی اور سیاسی موجودگی ہزاروں سعودیوں کا غصہ بڑھانے کا موجب ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ کینیا اور تنزانیہ کے امریکی سفارت خانوں میں جو بم پھٹے۔ وہ 1990ء میں کویت پر عراق کے حملے کے بعد سعودی عرب میں امریکی فوج کی آمد کی تاریخ کے عین آٹھ برس بعد پھٹے۔ امریکی فوج کو سعودی عرب کے بیمار شاہ فہد نے یہ کہہ کر بلایا تھا کہ جیسے ہی عراق کی جارحیت کا خطرہ ختم ہوا امریکی اپنی فوجیں نکال لے جائیں گے۔ امریکیوں نے اپنے وعدے کا پاس نہیں کیا اور آج ہزاروں امریکی فوجی سعودی عرب میں ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ سعودی عرب کی دفاع اور داخلہ کے وزارتوں میں ان کا اہم عملہ موجود ہے بالکل اسی طرح جیسے ایران میں شاہ کی معزولی سے پہلے تھا۔ وہ 1970ء کے عشرے میں ایران اور شاہ کا تقابل 1990ء کے عشرے میں سعودی عرب سے کر رہے ہیں۔ ایران کو امریکہ کا لائق اعتماد اتحادی اور قلعہ تصور کیا جاتا تھا۔ کیا یہ کوئی قابل قبول موازنہ ہے؟

ج: بالکل ہے 1980ء کے عشرے کے شروع میں سی آئی اے کے ایک سینئر افسر نے جو ریٹائرڈ ہو گئے تھے یا ریٹائرڈ ہونے والے تھے۔ ''آرمڈ فورسیز جرنل'' میں ایک نہایت دلچسپ مضمون لکھا، اس کا عنوان تھا۔ ''سعودی عرب کو امریکی خطرہ'' اس طویل مضمون کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ اسے سی آئی اے کے ایک تجربہ کار افسر نے عبدالقاسم منصور کے نام سے لکھا۔ اس نے اپنی شناخت چھپانے کے لئے عرب نام اختیار کیا۔ اس کی بنیادی دلیل یہ تھی کہ

امریکی حکومت اور کارپوریشن لالچ میں آ کر جو پالیساں اختیار کر رہی ہیں وہ سعودی عرب کو دوسرا ایران بنا دیں گی، یعنی امریکہ پر مکمل انحصار کرنے والا اور انقلاب کے خطرے سے ہمہ وقت دوچار ملک۔ اسامہ بن لادن آنے والے واقعات کی ایک علامت ہے۔ امریکہ کے لئے سعودی عرب میں رہنے کا کچھ لالچ اور استحصال کے سوا جواز نہیں۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ سعودی عرب کو کسی طرف سے حملے کا کوئی خطرہ نہیں۔ صدام حسین کی طرف سے جارحیت کا امکان ہو سکتا تھا لیکن وہ ہار گیا ہے۔

مزید برآں امریکیوں نے 1991ء سے عملاً ثابت کیا تھا کہ مشرق وسطیٰ میں اپنے کسی اتحادی پر حملے کے خلاف صف بندی کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد سعودی عرب میں امریکی فوج اور انٹیلی جینس کی موجودگی کا کیا جواز ہے؟ ہر وزارت میں امریکی مشیر گھسے ہوئے ہیں اس سے وہاں سخت بے اطمینانی پیدا ہو رہی ہے۔ اس کا جواب ہے صرف دولت۔ مختلف ذریعوں سے سعودی تیل پر امریکی مفادات کا کنٹرول ہے۔ وہی اس کی فروخت کے ذمہ دار ہیں۔ سعودی دولت امریکہ اور یورپ میں لگائی گئی ہے۔ 1980ء کی دہائی کے شروع میں سعودی اسلحے کی خریداری میں آئے اور 100 بلین ڈالر کے اسلحے خرید لئے۔ سعودی عوام لازماً بے اطمینانی کا شکار ہوں گے۔ فسک نے بالکل صحیح لکھا ہے۔

میں کچھ اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ سعودی بے اطمینانی کو صرف سعودی نہیں سمجھنا چاہیے۔ ایران کے برعکس سعودی عرب ایک عرب ملک ہے اور عرب دنیا کا حصہ ہے اس لئے اس میں جو بے اطمینانی پیدا ہوگی وہ اس کے اردگرد کے ملکوں میں بھی پیدا ہوگی، عرب اس وقت سخت دل برداشتہ، مایوس، مار کھائے ہوئے اور بے وقری کا شکار ہیں۔ وہ ہمارے اسلامی مقدس مقامات کے نگہبان ہیں لیکن وہ ان کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ وہ واحد لوگ ہیں جنھوں نے اقوام متحدہ کے قیام سے لے کر اب تک حملہ آوروں کے ہاتھوں اپنے علاقے گوائے ہیں اور انہیں واپس نہیں لے سکے۔ شام ایک مقبوضہ علاقہ ہے، لبنان پر جزوی قبضہ ہے، فلسطین پر مکمل قبضہ ہے، اور اس میں عوام مسلسل زمینیں کھود رہے ہیں اس صورتحال میں وہ امریکہ سے معاہدے کر رہے ہیں کہ وہ ان کے مفادات کی نگہبانی کرے گا لیکن ان معاہدوں پر عمل نہیں ہو رہا۔ معاہدے ہوتے ہیں لیکن دن رات ان کی خلاف

ورزی ہوتی رہی ہے۔ جیسا اوسلو کے معاہدے کی ہوئی۔ امریکہ نے شکایات دور کرنے کا وعدہ کیا لیکن پورا نہیں کیا۔ عربوں کے پاس اب دو ہی راستے ہیں جیسا کہ ان کے نوجوان دیکھتے ہیں کہ اولاً وہ سرگرم عمل ہوں۔ لڑیں اور مر جائیں اور اپنا گم شدہ وقار بحال کر لیں۔ کھوئی ہوئی آزادیاں اور کھوئی ہوئی زمینیں واپس حاصل کر لیں یا پھر غلام بن جائیں۔

آپ عربوں کے اجتماعی نقطۂ نظر سے صورتحال کا جائزہ لیں تو 200 ملین عوام کی بے دست و پائی کا منظر سامنے آجاتا ہے۔ ان کے پاس تیل کی دولت ہے، لیکن یہ دولت انہیں نہیں پہنچ رہی ان کے تیل کے کنوؤں کو عوام سے الگ کر دیا گیا ہے۔ قبائل کو جھنڈے دیئے گئے ہیں کویت، ابوظہبی، سعودی عرب اسی زمرے میں آتے ہیں۔ سعودی قبیلے کو ایک ریاست اس لئے دی گئی ہے کہ تیل کو عوام سے الگ رکھے۔ ان مسائل پر ذرائع ابلاغ کو نظر کرنی چاہیے وہ اس تجزیے سے اتفاق نہ کریں لیکن کشمکش کی تاریخ پر تو نظر کریں۔ دہشت گردی تاریخ کے بغیر نہیں۔ تمام معاشرتی احوال کی تاریخ میں ہی جڑیں ہیں۔ خطرے کی تاریخی جڑوں پر کوئی نظر نہیں کرتا۔

س: میں حیران ہوں کہ آپ تمام عربوں کو ایک جگہ کیسے اکٹھا کر سکتے ہیں۔ عربوں کے مختلف رنگ ڈھنگ اور کلچر ہیں۔

ج: عربوں میں چند چیزیں مشترک ہیں ایک تو زبان ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ زبان ایک مضبوط کڑی یا واسطہ ہے، دوسرے تاریخ ہے، ان کی تاریخ مدتوں سے ایک ہے، تیسرا سب سے اہم عنصر ان کا تشخص ہے، ان کی شناخت مشترک ہے۔ ظاہر ہے کہ سعودی خاندان اور کویتی شیوخ اپنے غریب عرب عوام سے کوئی تعلق اور رشتہ محسوس نہیں کرتے لیکن عرب مجموعی طور پر شناخت کا احساس رکھتے ہیں۔ میں شناخت کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ شناخت کے مسئلے پر غور کریں تو امریکہ ایک متنوع ملک ہے وہاں کالے لوگ ہیں، میکسکن ہیں گورے ہیں، باہر سے نئے آنے والے لوگ ہیں، وہ تمام ایک مختصر سے عرصے میں امریکی شناخت حاصل کر لیتے ہیں۔ امریکہ جب کسی جگہ حملہ کرتا ہے تو وہ اپنا رشتہ اپنے صدر (اچھے یا بُرے) سے جوڑتے ہیں، عرب پر حملہ ہو تو وہ کم سے کم اپنی شناخت کرتے ہیں۔ کم سے کم حملے کا ہدف بننے یا شکار ہونے کی شناخت کرتے ہیں اس لمحے جو چیز انہیں یکجا کر رہی ہے وہ مشترکہ نقصان اور مشترکہ احساس بے دست پائی ہے۔

جنوبی ایشیاء میں ایٹمی سیاست

س: آیئے ہم جنوبی ایشیاء کے واقعات کی طرف دھیان دیں۔ ہندوستان کو وسط مئی 1998ء میں زیرزمین ایٹمی دھماکے کرنے کا فیصلہ کیوں کرنا پڑا؟

ج: مختلف وجوہ کی بناء پر۔ دیکھا جائے تو یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دانائی دکھائی نہیں دیتی۔ دانش ودیانت سے دیکھیں تو ہندوستان کے دوسری مرتبہ ایٹمی ہتھیاروں کا تجربہ کرنے اور اسی طرح پاکستان کا اس کی پیروی میں دھماکے کرنے میں کوئی حکمت دکھائی نہیں دیتی۔ اس لئے ہندوستان کے فیصلے کی ایک ہی وجہ معلوم ہوتی ہے، وہ ہے اس کے ہندو نیشنلزم کی مخصوص برانڈ، جس کی نمائندگی بی جے پی کرتی ہے۔ بی جے پی کے لئے ''طاقتور'' کا تصور، فوجی طاقت ہے۔ اس کے خیال میں طاقت کے بل پر طاقت کے مظاہرے کے ذریعے ہی اثر قائم کیا جاسکتا ہے۔ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ پاکستان نے ان کے ایٹمی دھماکہ کرنے کے فیصلے کے ضمن میں کوئی کردار ادا کیا ہے۔ میرے خیال میں وہ دوسرے ایٹمی طاقتوں کے ہم پلہ بننے کی خاطر ایٹمی دھماکے کررہے تھے۔ انہیں توقع تھی کہ اس طرح وہ نیوکلیئر کلب کے ممبر بن جائیں گے۔ مجھے یا کسی کو بھی اس ممبر شپ کی افادیت کا کوئی علم نہیں۔ اگر کسی پر یہ واضح ہے تو اس نے وضاحت نہیں کی۔

میرے خیال میں وہ قوم کا طاقتور ہونا فوجی طاقت سے لازم سمجھتے ہیں، ورنہ اس میں کوئی دانائی نہیں۔ 1962ء کی ہند چینی جنگ کے بعد ہندوستان تقریباً تیس برس تک چین سے تعلقات بہتر بنانے میں ناکام رہا، لیکن اب یہ تعلقات تیزی سے بہتر ہونے لگے ہیں۔ ہندوستان اور چین کے ہمسائے سوچنے لگے ہیں کہ کیا ایشیا کے ان دو بڑے دیو جیسے ملکوں میں قریبی اور دوستانہ تعلقات سے تیسری دنیا کے عوام کو فائدہ پہنچے گا؟ گزشتہ برس چین کے صدر اور وزیراعظم نے ہندوستان اور پاکستان کا دورہ کیا۔ پاکستان میں انہوں نے پاکستانی قیادت پر زور دیا کہ وہ ہندوستان کے ساتھ امن قائم کریں چاہے اس کے لئے انہیں کشمیر پر مصالحت کرنی پڑے۔ گزشتہ دس برسوں میں ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی یہ واحد بڑی کامیابی تھی، بی جے پی کی قیادت نے ایک ہی دن میں یہ کامیابی تباہ کردی اور چین کو ایک بار پھر مخالف بنالیا۔ پوکھران میں ایٹمی دھماکہ کرنے سے پہلے چین کے خلاف زبانی کلامی بڑی مہم چلائی گئی۔ ہندوستان چین کے ساتھ اسلحے کی دوڑ میں شامل نہیں ہوسکتا۔ یہ

ہندوستان کے لئے تباہ کن ہوگا۔ جس طرح پاکستان ہندوستان کے ساتھ اسلحے کی دوڑ شروع کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

دوسرے ہندوستان اقتصادی لحاظ سے حیران کن ملک ہے۔ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے اور چالیس برسوں تک اس کی معیشت کی ترقی کی رفتار3.5 سے 4 فیصد تک رہی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ہندوستان کے پاس بے پناہ وسائل ہیں انسانی بھی اور مادی شکل میں بھی۔ لیکن اس کی پیداواری شرح بے حد کم رہی ہے۔ سوشل سائنس دان یہ کرتے ہیں کہ جب وہ کوئی حقیقی سبب معلوم نہیں کر سکتے، تو ایک محاورہ تخلیق کر لیتے ہیں، چنانچہ انہوں نے اسے ''ہندوشرح پیداوار'' کہنا شروع کر دیا۔ گویا اس میں کلچر کا بھی دخل ہے۔ گذشتہ سات برس میں ہندوستان ''ہندوشرح پیداوار'' کے حصار سے نکل آیا ہے اس کی شرح نمو اور ترقی میں اضافہ ہونے لگا۔ 1997ء میں ہندوستان کی شرح نمو 7.5 فیصد تھی۔ 1998ء میں 7 فیصد رہی لیکن ایٹمی دھماکے کے بعد یہ شرح کم ہوکر 4 فیصد رہ گئی۔ انہوں نے خود اپنا نقصان کیوں کیا؟ ہندوستان کو اس وقت اصل ضرورت غریبوں کا پیٹ بھرنے کی ہے۔ 400 ملین افراد خط غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ صحت مند انسانوں کی طرح زندہ رہنے کے لئے جتنے غذائی حرارے ضروری ہیں وہ انہیں میسر نہیں۔ کیا وجہ ہے کہ اقتصادی ترقی کا جو عمل شروع کیا گیا تھا اُسے معکوس کرنا شروع کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان علاقائی طاقت بننے کا خواہشمند ہے۔ حالانکہ علاقائی طاقت بننے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اس کے ہمسایوں سے بہتر تعلقات ہوں، اندر کمار گجرال کی حکومت بنگلہ دیش، سری لنکا اور نیپال سے تعلقات بہتر بنانے میں کامیاب رہی تھی۔ ایٹم بم کا دھماکہ کرنے سے علاقے میں ایک بار پھر کشیدگی بڑھ گئی ہے اور چھوٹے ہمسائے ڈر گئے ہیں۔ جنوبی ایشیا میں ایٹمی جنگ ہوئی تو اس میں ہندوستان اور پاکستان کے لوگ ہی نہیں مریں گے۔ جنوبی ایشیاء ایک جغرافیائی اور ماحولیاتی اکائی ہے یہاں بم ہر ایک کو متاثر کرے گا، کیونکہ ہوا ہر رُخ میں چلتی ہے اور فاصلے طے کرتی ہے اور یہاں تو فاصلے بہت کم ہیں۔

س: انگریزی روزنامہ ''ہندو'' کا کالم نگار پریم شنکر جھا ہندوستان کے اقدام (بم دھماکے) کا الزام پاکستان کے سر دھرتا ہے۔ مئی 1998ء میں اس نے لکھا کہ ہندوستان نے ایٹم بم کا تجربہ اس لئے کیا کہ پاکستان نے ماہ اپریل میں درمیانے فاصلے تک مار کرنے والے

میزائیل غوری کا تجربہ کرکے برصغیر میں طاقت کا توازن بگاڑ دیا تھا۔اس موقع پر پاکستانی ترجمانوں نے کہا کہ غوری کی کامیابی سے، ہندوستان کا کوئی شہر بھی پاکستان کے حملے سے محفوظ نہیں رہا۔ میزائیل کا نام افغان حملہ آور شہاب الدین غوری کے نام پر رکھا گیا، جس نے1193ء میں شمالی ہندوستان میں پہلی مسلم سلطنت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ چند روز بعد پاکستان نے اعلان کیا کہ وہ جلد طویل فاصلے تک مار کرنے والے میزائیل غزنوی کا تجربہ کرے گا اسے محمود غزنوی کے نام سے منسوب کیا جانا تھا، جس نے دسویں صدی کے آخر میں مغربی ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔ مزائیلوں کا نام رکھنے کے ضمن میں جن جارحانہ عزائم کا اظہار کیا گیا اور بھارتی شہروں کو نشانہ بنانے کی صلاحیت حاصل کرنے کا جو چرچا کیا گیا اس نے ہندوستان کے طول وعرض میں کپکپی دوڑا دی اس طرح جھا کے مطابق ہندوستان کو ردِ عمل ظاہر کرنے پر اُکسایا(9)۔اس تجربے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج: سب سے پہلے بحیثیت پاکستانی میں کہوں گا کہ غوری کا تجربہ کرنا غلط تھا۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میزائیل کا پہلا نام حتف تھا جسے بدل کر غوری رکھنا ہر لحاظ سے غلط اور اشتعال انگیز تھا۔ میزائیل کا نام غوری رکھنا حکومت پاکستان اور اس کے افسروں کی زبان سے ناسمجھی کا ثبوت تھا۔لیکن غوری سے پہلے ہندوستان نے پاکستان کی سرحد پر''پرتھوی میزائیل'' نصب کر دیا تھا۔ ہندوستانی لیڈروں نے بھی ویسے ہی اشتعال انگیز بیانات دیئے تھے جو پریم شنکر جھا نے پاکستانی لیڈروں سے منسوب کئے ہیں میں ان کی مذمت کرتا ہوں۔دونوں طرف سے اس نوع کے بیانات دینے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

ہندی میں پرتھوی کے معنی زمین ہے۔ پاکستانی حکمران یہ نہیں جانتے تھے انہوں نے خیال کیا کہ یہ نام پرتھوی راج چوہان کے نام پر رکھا گیا ہے جو بارہویں صدی میں ہندو راجپوت حاکم تھا اور اس نے شہاب الدین غوری کو کئی بار شکست دی تھی آخر میں اس نے غوری سے شکست کھائی۔ بہرحال پاکستان نے اپنے مزائیل کا نام غوری رکھ لیا۔اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہم تاریخ کو مسخ کر رہے ہیں، اور قرون وسطٰی کے مزاج کو سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ پرتھوی راج چوہان اس لئے شہاب الدین غوری سے نہیں لڑ رہا تھا کہ وہ ہندو تھا اور شہاب الدین غوری بھی پرتھوی سے اس لئے نہیں لڑ رہا تھا کہ وہ مسلمان تھا۔ یہ ایک صورت میں ازمنۂ وسطٰی کے حکمران تھے۔ فاتح اور حملہ آور تھے دوسری صورت میں

بادشاہ تھے جو زمین اور علاقوں کے لئے جنگ آزما رہے تھے۔ پریم شنکر جھا یہ جانتے ہیں کہ شہاب الدین غوری نے راستے میں آنے والے نصف درجن مسلمان حکمرانوں کو شکست دینے کے بعد پرتھوی راج چوہان سے جنگ کی تھی، لیکن ہو کیا رہا ہے ہم پہلے کیا بات کر رہے تھے اور اب ہمیں کیا مسئلہ درپیش ہے۔ مسخ شدہ تاریخوں نے ایک نئی طرح کی ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ تخلیق کی ہے۔ ''ہندو تاریخ'' اور ''مسلم تاریخ'' فکر و نظر کے اس مسخ شدہ انداز اور طریقے نے ایک طرف پرتھوی اور دوسری طرف غوری کے سلسلے میں غلط فہمیاں پیدا کی ہیں۔

یاد کریں تو میزائل دوڑ، اس وقت نہیں شروع ہوئی جب پاکستان نے غوری کا تجربہ کیا۔ ہندوستان کا میزائل سسٹم ''پرتھوی'' پہلے سے ہر جگہ موجود تھا اور ہندوستان کے زیادہ ترقی یافتہ میزائیل ''اگنی'' کا ''غوری'' سے پہلے تجربہ کیا جا چکا تھا۔ اس لئے پریم شنکر جھا کا جو آزاد صحافی ہیں، نیشنلسٹ خطوط پر سوچنا اور عمل کرنا مفید نہیں میرا خیال ہے کہ ہمیں یہ باور کر لینا چاہیے کہ پاکستانی اور ہندوستانی حکمران ازمنۂ وسطیٰ کی فوجی مہمات کے اثر میں آ گئے ہیں۔ وہ کلنٹن اور بش سے زیادہ ماڈرن نہیں جو اقتدار کو فوجی طاقت کے حوالے سے ہی دیکھتے ہیں۔ ہم جدید دور میں رہ رہے ہیں لیکن ہم پر ازمنہ وسطیٰ کی فکر کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

س: وزیراعظم نواز شریف نے مئی کے دھماکوں کے بعد کہا کہ پاکستان کے لئے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ ان کے پاس تو کھیل کا میدان بھی نہیں تھا۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ پاکستان کے پاس کوئی راستہ تھا؟

ج: یقیناً تھا۔ ہمارے پاس جو شہادت ہے اس کی بناء پر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے کہ اپنے اسلحوں کا تجربہ کر لینے کے بعد ہندوستان کے لیڈر سخت مضطرب تھے کہ اگر پاکستان نے تجربہ نہ کیا تو وہ (ہندوستان کے لیڈر) دنیا بھر میں بہت بُرے سمجھے جائیں گے۔ انہوں نے اپنے مزائیلوں کا تجربہ کر لینے کے بعد اشتعال انگیز بیان دینے شروع کر دیئے، جس کے لئے پریم شنکر جھا نے پاکستانی حکومت کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے اور کہا ہے کہ غوری میزائیل کا تجربہ کرنے کے بعد پاکستان نے اشتعال انگیزی شروع کر دی۔ ہندوستان کے وزیر خارجہ نے کہا کہ پاکستان کو جنوبی ایشیاء میں اپنی پوزیشن کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے،

کیونکہ فوجی توازن بدل گیا ہے۔ ایل کے ایڈوانی نے جو ہندوستان کے وزیر داخلہ ہیں، کہا کہ فوجی توازن بدل گیا ہے اور ہندوستان، پاکستان کے اندر جا کر کشمیر کے ان حصوں پر قبضہ کرے گا جو اس وقت پاکستان کے پاس ہیں۔ وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی نے کہا کہ فوجی توازن برقرار نہیں رہا پاکستانیوں کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے۔ اس طرح کے اشتعال انگیز بیانات دیئے جانے لگے اور کشمیر میں سرحد پر جھڑپیں بھی ہونے لگیں۔

بہرحال اس قسم کی اشتعال انگیزی کا جواب دینا، ذمہ دار قیادت کو زیب نہیں دیتا میں بھی پریم شنکر جھا کی طرح غلطی کروں گا اگر یہ کہوں کہ پاکستان کے پاس اپنے بموں کے دھماکے کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا، امن کے لئے زمین ہموار کرنے کی کیا صورت ہو؟ میرے خیال میں ہمیں ایٹمی اسلحوں کا تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ آج بھی میری یہی رائے ہے محض اس لئے کہ ہندوستان نے ایسا کیا اور ہندوستان کے لیڈروں نے اشتعال انگیز بیانات دیئے ہیں ہمیں مشتعل نہیں ہونا چاہیے۔ میں ایٹمی ہتھیاروں پر یقین نہیں رکھتا۔ ہندوستان کے پاس ایٹمی اسلحہ ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ پاکستان کے پاس بھی ہونا چاہیے، ہمیں ایٹمی اسلحے کے سلسلے میں ہندوستان کے ساتھ مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔

س: پاکستانی ایٹمی دھماکوں کے بعد کے حالات اور واقعات کے بارے میں جان برنز نے نیویارک ٹائمز میں لکھا۔ ''وزیراعظم نواز شریف نے چند گھنٹوں کے اندر اعلان کیا کہ ان کا ملک ایٹمی طاقت بن گیا ہے اور یوں اپنے ایک پیش رو کے خفیہ منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیا، جس کا تیس برس قبل یہ کہہ کر اعلان کیا گیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی بم بنائے گا۔ (10) وہ کس پیش رو کا ذکر کر رہے تھے؟

ج: وہ ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں بات کر رہے تھے جنہوں نے کبھی اسلامی بم کا ذکر نہیں کیا۔ یہ کہنا غلط بیانی ہے۔ یہ غلط بیانی جو بیس برس پہلے شروع ہوئی اور آج بھی پھیلائی جا رہی ہے، ذوالفقار علی بھٹو نے کئی غلطیاں کیں اور کئی زیادتیاں کیں، لیکن یہ کبھی نہیں کہا کہ وہ اسلامی بم بنانے جا رہے ہیں۔ انہوں نے یہ ضرور کہا کہ ہر کسی کے پاس بم ہے یہودی عوام کے پاس بم ہے، عیسائی طاقتوں کے پاس بم ہے، اب ہندوستان جو اپنے آپ کو ہندو طاقت سمجھتا ہے بم بنا رہا ہے پھر مسلم اپنا بم کیوں نہ بنائیں؟ وہ اسلامی بم کے قریب کی باتیں کرنے لگے تھے لیکن انہوں نے اسلامی بم کا نام نہیں لیا تھا۔

MashalBooks.org

مجھے شک ہے کہ پاکستانی بم اسلامی بم ہے میں نے پاکستان میں زور دے کر کہا کہ یہ اسلامی بم نہیں اسے اسلامی قرار بھی نہیں دیا جاسکتا اسے مسلمان نہیں بنایا گیا پاکستان کسی بھی قومی ریاست کی طرح ہے یہ بم پاکستانی رہے گا اسلامی نہیں ہوگا اس کا تعلق پاکستان کے خدشات اور بھارت کے ساتھ اس کے مقابلے سے ہے، اگر ہندوستان نے 1974ء میں بم کا دھماکہ نہ کیا ہوتا تو پاکستان نے بھی بم کبھی نہ بنایا ہوتا۔ میں اسلحوں کے مقابلے اور ہتھیاروں کی دوڑ کا دفاع نہیں کرسکتا میں اس بات کا بھی قائل نہیں کہ اشتعال میں آ کر ایٹم بم بنالیا جائے یہ قومی سلامتی کے اقدامات نہیں بچکانہ حرکات ہیں۔

س: اکبر احمد نے اپنی کتاب ''جناح، پاکستان اور اسلامی شناخت'' میں پاکستانیوں کے عدم تحفظ کے گہرے احساس کا ذکر کیا ہے۔(11) اس کی بنیاد کیا ہے؟ پاکستان کے ایٹمی بموں کے دھماکوں کے بعد گلی کوچوں میں جو مظاہرے ہوئے میں نے ان کی تصویریں دیکھی ہیں مظاہرین نے ایسے کتبے اٹھائے ہوئے ہیں جن پر لکھا تھا ''ہم گھاس کھالیں گے لیکن ایٹم بم ضرور بنائیں گے۔''

ج: پہلی بات یہ ہے کہ پاکستانیوں میں عدم تحفظ کا احساس موجود ہے۔ میں پہلے دو باتوں کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ بموں کے تجربات پر ہندوستان اور پاکستان دونوں میں خوشی کے جذبات کا اظہار کیا گیا۔ اس ضمن میں پاکستانی ہندوستان کے لوگوں سے قطعاً مختلف نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں ایک حقیر سی اقلیت نے بم دھماکوں پر خوشی کا اظہار کیا ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے میں اس امر کا شاید ہوں کہ 29 مئی کے بعد پہلے تین روز تک ٹیلی وژن پر جو تصویریں دکھائی گئیں وہ ان تصویروں کے لئے مغربی میڈیا کی دوڑ کا نتیجہ تھیں۔ جو کچھ اصل میں ہوا میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ دھماکے کے دوسرے روز مغربی ذرائع ابلاغ کے نمائندے پاکستان پہنچ گئے صبح کو پاکستانی افسروں نے ان کے لئے پریس کانفرنس کا اہتمام کیا۔ اسلام آباد میں آب پارہ کے علاقے میں حکومت کے ایجنٹوں نے دکانداروں سے جا کر کہا کہ وہ دکانیں بند کر دیں اور بم کے دھماکے کی حمایت میں مظاہرہ کریں۔ زیادہ سے زیادہ پچاس یا ساٹھ افراد جمع ہوئے انہیں پھولوں کے گلدستے دیئے گئے دو افسر حلوائی کی دکان میں گئے اور ساری مٹھائیاں خرید کر تقسیم کرنا شروع کر دیں انہوں نے کیمرہ مینوں سے کہا کہ وہ تصویریں لینا شروع کریں۔

بس اسلام آباد میں یہی مظاہرہ تھا میں نے اسلام آباد یا راولپنڈی میں مسرت کا کوئی بھرپور مظاہرہ نہیں دیکھا۔

ایک ہفتہ بعد نواز شریف لاہور گئے وہاں مسلم لیگ نے ان کے استقبال کے لئے ایک عوامی مظاہرے کا اہتمام کیا۔ یہ سب سرکاری تھا۔ یہ سرکاری اہتمام میں ہونے والی تقریبات تھیں۔ مغربی ذرائع ابلاغ یہ نہیں پہچان پائے کہ وہ سرکاری اہتمام سے منعقد ہوئی تھیں ان میں عوامی مسرت کا بے ساختہ اظہار نہیں تھا یہی کچھ ہندوستان میں بھی ہوا مجھے علم تو نہیں لیکن اگر وہاں بھی وہی کچھ ہوا جو یہاں ہوا تو مجھے حیرت نہیں ہوگی۔

ہندوستان کی پبلک اور پاکستان کی پبلک اور وہ بھی جو دھماکوں پر خوش ہوئے جاتے ہیں کہ یہ بڑا سنگین معاملہ ہے اس پر خوشی کا اظہار کرنا مناسب نہیں یہ خوشی منانے کا لمحہ نہیں تھا۔ اسی سال دونوں ملکوں میں ہیروشیما کا دن منانے کے سلسلے میں بھاری مظاہرے ہوئے۔ ہندوستان میں پاکستان کے مقابلے میں زیادہ بڑا مظاہرہ ہوا۔ کلکتہ میں ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف دولاکھ پچاس ہزار لوگوں نے مظاہرہ کیا، دہلی میں ان کی تعداد تیس ہزار تھی مغربی دنیا میں پہلے بلکہ دس سالوں کے دوران ایسا کوئی مظاہرہ نہیں ہوا جس میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے جانے کی مذمت کی گئی ہو میں یہ مغرب کی مذمت میں نہیں کہہ رہا بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کے خطرات کا احساس اور شعور 1948ء یا 1950ء کے مقابلے میں آج زیادہ ہے۔

اب پاکستان کے عدم تحفظ کی طرف آتے ہیں یہ ملک کئی وجوہ کی بناء پر اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔ میرے خیال میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ملک ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں بنا ہے۔ تقسیم سے متعلق بہت سے معاملات ابھی تک طے نہیں ہوئے۔ کشمیر کا مسئلہ انہی میں سے ہے۔ یہ کہنا کہ عدم تحفظ کا احساس اس وجہ سے ہے کہ ہندوستان نے پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا، یہ پاکستانیوں کا خیال غلط ہے، میرے خیال میں ہندوستان نے ہندو نیشنلسٹوں سمیت تقسیم کی حقیقت تسلیم کر لی ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ ملک بنگلہ دیش کے قیام کی صورت میں پہلے ہی ٹوٹ چکا ہے مشرقی پاکستان کی پاکستان سے علیحدگی کے سبب سے جو احساس پیدا ہوا وہ ختم نہیں ہوا، یہ بھی ہے کہ استحکام کا احساس پوری طرح بیدار نہیں ہوا۔ تقسیم کے بعد کے پچاس سال میں 25 سال

فوجی حکومت رہی اور 25 برس غیر مستحکم راشی، بدعنوان اور ناکارہ سول حکومت رہی۔ لوگ عدم استحکام کی حالت میں زندگی بسر کرتے رہے انہیں بہت بڑے اور دشمن ہمسائے کا سامنا رہا' جو'' تاریخی ہندوستان'' کے اندر سے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے اس امر کے باوجود کہ ان کی حیثیت مستقل ہے یا نہیں، وہ غیر محفوظ محسوس کرتے رہیں گے یہ ایک اور وجہ یہ ہے کہ ہمیں ایٹمی ہتھیار حاصل نہیں کرنے چاہیے تھے۔

س: لیکن جن تو بوتل سے نکل چکا ہے اسے دوبارہ بوتل میں بند نہیں کیا جا سکتا۔

ج: اس لئے اور زیادہ ضروری ہے کہ بین الاقوامی برادری اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے اس جن کو بوتل میں بند رہنے دے۔ پاکستان اور ہندوستان پر بین الاقوامی دباؤ ہے۔ اسرائیل پر کوئی بین الاقوامی دباؤ نہیں کہ وہ ایٹمی جن کو بوتل میں ہی بند رکھے اور نہ یہ کہ وہ بڑی سے بڑی بوتل بنائے اور اسے زیادہ مار کرنے کے قابل نہ بنائے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ اس کو اور اس کے استعمال کو کسی موثر ضابطے کے تحت کس طرح لایا جائے؟ جن کو بوتل میں بند نہیں کیا جا سکتا لیکن اسے بڑھنے پھیلنے سے روکا جا سکتا ہے۔

نیشنلزم اور اسلام

س: ہندوستان کی وسیع مسلم آبادی کی ماڈی اور نفسیاتی حالت کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انڈونیشیا کے بعد ہندوستان میں دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی ہے ہندوستان کے ساتھ ہندی مسلمانوں کے احساسِ یگانگت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ بالخصوص فرقہ پرستی کی فضا میں۔

ج: یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔ میرے خیال میں 1947ء میں برصغیر کی تقسیم سے ہندوستان کے مسلمانوں کی شناخت بڑی حد تک کچلا گئی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان میں اکثر نے پاکستان اور اس کے قیام سے ہمدردی رکھی ہے، بہتوں کے لئے یہ سوال ذہنی الجھاؤ کا موجب تھا کہ تقسیم کا مطلب کیا ہے؟ اور وہ خود کیا ہیں؟ اسے ہندو اور گاندھی کے سیکولر نظریات کی کامیابی سمجھنا چاہیے کہ پچاس سال بعد ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھنے لگے ہیں وہ ہندو انتہا پسندوں کے عروج کے باعث اپنے آپ کو غیر محفوظ ضرور سمجھتے ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو ہندوستانی قرار دیتے ہیں باہر سے آئے ہوئے نہیں۔ اور نہ کہیں اور جانے کی سوچتے ہیں کہتے ہیں یہیں جزا بھی ملے گی اور سزا بھی۔ روز قیامت

تک ہمیں یہیں رہنا ہے۔ ان میں ہندوستانی ہونے کا احساس بدرجۂ اتم موجود ہے میں جب بی بی سی کی ڈاکومنیٹری کے لئے گیا تو مجھے اس کا اور زیادہ احساس ہوا۔ یہ اسرائیل مین اور مقبوضہ علاقوں میں آباد عربوں سے بہت مختلف ہے وہ اپنے آپ کو اسرائیلی محسوس نہیں کرتے وہ یہ محسوس نہیں کرتے کہ وہ جس ریاست میں لے جائے گئے ہیں ان کا تعلق اس سے ہے۔ ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھتے ہیں اور اس کے لئے مرنے مارے کے لئے تیار ہیں۔ یہ انڈین نیشنل کانگرس اور گاندھی اور نہرو کی قیادت کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ میرے خیال میں لوگ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ مسلم قیادت کی بھی کامیابی ہے جو ہندوستان میں ہی رہی اور جس نے پاکستان کی مخالفت کی، ابوالکلام آزاد اس میں شامل ہیں۔

س: لیکن مسلمانوں کی قیادت میں اساتذہ اور علماء بھی شامل تھے۔

ج: اس میں ہندوستان اور پاکستان کے تمام اسلامی سکالر اور علماء شامل تھے۔ درحقیقت علماء نے بالعموم تحریک پاکستان کی حمایت نہیں کی اسے ستم ظریفی کہہ لیں لیکن یہ حقیقت ہے۔ 1920ء اور 1930ء کی دہائیوں میں یہودی سکالروں نے بھی صیہونی تحریک کی حمایت نہیں کی تھی ان کے خیال میں یہ یہودیت کے عالمی تصور کے خلاف تھا۔

س: آج پاکستان میں بنیاد پرست جماعتیں یقینی طور پر نیشنلسٹ ہیں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: میرا نہیں خیال کہ انہیں نیشنلسٹ کہا جا سکتا ہے وہ ''اصلاً اسلام پسند'' ہیں وہ ریاستی طاقت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس اعتبار سے انہیں نیشنلسٹ کہا جا سکتا ہے لیکن جس خیال سے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے اس کے لحاظ سے وہ نیشنلسٹ نہیں ''وہ پان اسلام'' کے حامی ہیں۔

س: وہ ایک مذہبی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں؟

ج: وہ پاکستان میں ایک مذہبی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسے دوسرے علاقوں میں مذہبی حکومتوں کے قیام کی طرف پہلا قدم سمجھتے ہیں۔ وہ ایک عمومی مذہبی تحریک کا جو اسلامی ملکوں میں چل رہی ہے اپنے آپ کو حصہ سمجھتے ہیں۔ اس تحریک کو امریکہ نے افغانستان میں اپنی کوششوں کے ذریعے بڑھاوا بھی دیا اور مسلح کردار بھی۔ افغانستان میں کیا ہوا؟ مغرب میں اس پر غور نہیں ہوا۔ جب سوویت یونین نے افغانستان میں مداخلت کی تو امریکہ نے اسے اپنے لئے دوہرا موقع محسوس کیا، ایک یہ کہ یہاں سوویت یونین کو ویت نام کی طرز

MashalBooks.org

پر الجھایا جاسکتا ہے، دوسرے جو بعد میں بہت اہم ثابت ہوا یہ کہ پوری اسلامی دنیا کو سوویت یونین اور کمیونزم کے خلاف متشددانہ طرز طور پر صف آراء کیا جاسکتا ہے۔ پوری اسلامی دنیا کو ایک ''شیطانی سلطنت'' کے خلاف منظم کرنے کی کوشش میں۔ سی آئی اے نے دنیا بھر سے رضا کاروں کو افغانستان میں لڑنے کے لئے آنے میں مدد دینا شروع کر دیا۔ کمیونزم مخالف نظریے راسخ کرنا اور کمیونسٹوں کو جہاں بھی ملیں مارنے کی تربیت دینا اس مہم کا حصہ تھا۔ اس طرح سرگرم اور فعال افراد کو بھرتی کرنا اور انہیں افغانستان بھیجنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں نے الجزائر، سوڈان، سعودی عرب، مصر، اردن، حتیٰ کہ فلسطین تک سے انہیں جہازوں میں بھر بھر کر افغانستان بھیجتے دیکھا۔ اس وقت اسرائیل، پی ایل او میں یاسر عرفات کی تنظیم الفتح کے مقابلے میں حماس کی حمایت کر رہا تھا۔ جو لوگ افغانستان لائے جاتے انہیں بتایا جاتا کہ مسلح جدوجہد نیکی اور پاکبازی کا کام ہے۔ اس طرح جہاد کے تصور کے تحت بین الاقوامی سطح پر پان اسلامی دہشت گرد تحریک کا آغاز ہوا۔ امریکہ نے ہمارے دور کے بن لادن پیدا کرنے کے لئے اربوں ڈالر صرف کئے۔ میں 1998ء میں افغانستان میں ظواہر کیمپ دیکھنے گیا۔ سی آئی اے، اس کی کرتا دھرتا تھی۔ افغانستان سے سوویت یونین کے انخلاء کے بعد بھی امریکہ نے بن لادن اور دوسروں کی حمایت کرنا ترک نہیں کیا وہ ان کی حمایت کرتا رہا۔

سوویت یونین 1990ء میں ختم ہوا۔ 1991ء کے بعد سے ایک نئی صورت نمایاں ہوئی۔ امریکہ نے بہت سے لوگوں کے ساتھ اپنا تعلق منقطع کرلیا، جو وعدے کئے تھے توڑ دیئے، جو مدد دی جاتی تھی وہ واپس لے لی گئی امریکہ نے سب سے پہلے منشیات کے مسئلہ پر پیش قدمی شروع کی۔ افغانستان اور پاکستان 1980ء کے عشرے میں منشیات کے کاروبار کے سب سے بڑے مرکز بن گئے تھے۔ بہت سے لوگ جنہیں سی آئی اے کی حمایت حاصل تھی منشیات کی تجارت میں حصہ لینے لگے تھے لیکن امریکہ کو اب ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ سو اس نے پاکستان اور سعودی عرب کی حکومتوں پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ ان گروہوں پر جو پہلے امریکہ کے لئے کام کرتے رہے تھے ہاتھ ڈالیں، انہیں دو طرح سے زک پہنچی۔ ایک تو اُن سے جو وعدے کئے گئے تھے وہ پورے نہ کئے گئے۔ دوسرے پرانے دوستوں سے دشمنوں کا سا سلوک روا رکھا جانے لگا۔

MashalBooks.org

یہ لوگ کون ہیں؟ ان میں اکثریت قبائیلیوں کی ہے، اسامہ بن لادن کا تعلق بن لادن قبیلہ سے ہے، رمزی یوسف افغان ہے اور بن لادن کے ساتھیوں میں شمار ہوتا ہے، ایمل کانسی ایک بلوچ قبائلی ہے۔

س: رمزی یوسف کو عالمی ٹریڈ سنٹر پر بم پھینکنے کے سلسلے میں شناخت کیا گیا تھا؟

ج: ایمل کانسی کو سی آئی اے کے دو ایجنٹوں کو قتل کرنے کے الزام میں سزا دی گئی ہے۔ بن لادن سعودی ارب پتی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کینیا اور تنزانیہ کے امریکی سفارت خانوں پر بموں کے حملوں میں اس کا ہاتھ تھا۔ یہ حملہ 1998ء میں ہوا رمزی یوسف کون ہے کہاں کا ہے؟ یہ طے نہیں غالباً پاکستانی ہے وہ عمان میں پلا بڑھا ہے وہ پھر افغانستان میں لڑنے آیا ان سب کا تعلق افغانستان سے ہے۔ سی آئی اے کا ان سے رابطہ رہا ہے وہ قبائلی ہیں جن کا اپنا ضابطہ ہے اس کے دو مرکزی الفاظ ہیں ایک وفاداری دوسرا انتقام۔ قبائلی نظام وفاداری اور انتقام ہی کے محور پر چلتا ہے۔ جب آپ کا کوئی دوست جس کے آپ وفادار رہے ہیں، دغا کرتا اور دھوکہ دیتا ہے تو اس سے انتقام لینا فرض ہو جاتا ہے یہ لوگ غصے میں ہیں کہ انہوں نے وفاداری کی لیکن ان سے دھوکہ کیا گیا۔ دوسرے انہیں تربیت دی گئی اور غیر ملکی قابض کے خلاف (جو افغانستان میں سوویت یونین تھا) جنگ کرنے کے لئے ہر طرح کے ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا۔ اب جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی سرزمین پر امریکہ قابض ہو گیا ہے، جیسا کہ بن لادن نے دیکھا تو انہوں نے ایک مختلف مسئلہ اُٹھایا۔ بن لادن اس مشن کو پورا کرنے میں لگا ہوا ہے جسے اس نے اپنا مقصود ٹھہرایا تھا۔ اب وہ امریکہ کے خلاف نبرد آزما ہے کیونکہ اس کے نقطۂ نظر سے امریکہ نے اس کی سرزمین پر قبضہ کیا ہوا ہے۔

سرد جنگ کے بعد یک طرفہ اقدامات

س: سوڈان اور افغانستان پر امریکہ کے میزائیلوں سے حملے گذشتہ چند دہائیوں کے دوران دوسرے ملکوں پر کئے جانے والے ان حملوں کی یاد دلاتے ہیں جو دہشت گردی کے خلاف کی جانے والی کاروائی کا حصہ تھے۔ اب یہ عام معمول بن گیا ہے کہ اعلیٰ انتظام افسر اور جرنیل نقشوں اور مصنوعی سیاروں سے لی جانے والی تصویروں کے حوالے سے منتخب نشانوں پر حملے کراتے ہیں۔ ہدف بننے والے کردار بدلتے رہتے ہیں۔ البتہ ابوندال، معمر قذافی،

صدام حسین، پی ایل او اور اب بن لادن مستقل اہداف میں شامل ہیں۔ انہیں بدی کی تجسیم اور ایسے دیو بنا کر پیش کیا جاتا ہے جنہیں مٹاڈالنا ضروری بتایا جاتا ہے۔

ج: یہ قابلِ فہم ہے، یہ انداز مسلسل دہرایا جاتا ہے۔ اصل سوال یہ ہیں کہ اس سے دنیا اور خود امریکہ کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟ اس طرزِ عمل سے کسی قسم کا بین الاقوامی نظام ظہور میں آرہا ہے؟ آپ نے جتنی بھی مثالیں بیان کی ہیں وہ سرد جنگ سے متعلق ہیں، سرد جنگ ختم ہوگئی ہے، لیکن اس کی پیدا کردہ کیفیت باقی ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ امریکہ کے سیاسی کلچر کے حوالے سے اس کے کیا معنے ہیں؟ بین الاقوامی اداروں مثلاً اقوام متحدہ اور اقوام متحدہ کے منشور کے حوالے سے اس کا کیا مطلب ہے؟ بین الاقوامی عدالتِ انصاف کے ضمن میں اس کے کیا معنی ہیں؟

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس دور میں کہ امریکہ یک طرفہ کارروائی کر رہا ہے اور یک طرفہ اقدام کرنے کو اپنا حق جتاتا ہے اور ایسے میں کہ وہ سپر پاور ہے اور اسے بین الاقوامی اداروں تک رسائی حاصل ہے بلکہ وہ انہیں کنٹرول کر رہا ہے وہ روم کیوں نہیں جاتا اور عدالتِ انصاف کے سامنے افغانستان میں لادن کے اڈے اور خرطوم میں فیکٹری سے اس کے تعلق کے بارے میں شواہد کیوں پیش نہیں کرتا اور یوں ان پر حملوں کا جواز کیوں فراہم نہیں کر لیتا؟ سیاست کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ جب کسی طاقت کے مقابل کوئی قوت موجود نہ ہو جو توازن فراہم کر سکے یا اُسے روک ٹوک سکے تو اس کا ہمیشہ غلط استعمال ہوتا ہے اور انتہائی طور پر ہوتا ہے۔ موجودہ دور کی سب سے خطرناک صورت یہ ہے کہ ایک طاقت پوری دنیا پر فوجی طور پر حاوی ہے۔ امن و قانون اور سلامتی کے بین الاقوامی اداروں پر بھی حاوی ہے اور ایسے میں کہ اس کا کوئی مقابل نہیں ہے۔ رواں عالمی نظام کمزور اور غریب ملکوں کے لئے خاص طور پر خطرناک ہے۔ سرد جنگ کے دور سے بھی زیادہ پُرخطر۔ ہم سرد جنگ کے زمانے سے بھی زیادہ بُرے وقت میں ہیں۔

س: آپ یہ تو نہیں کہہ رہے ہیں کہ سرد جنگ دور میں ایٹمی تباہی کا جو امکان تھا موجودہ صورتحال میں بھی ویسا ہی ہے؟

ج: ایٹمی تباہی کا امکان غالباً کچھ کم ہوا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ سویت یونین اور امریکہ کا ایک دوسرے کو مٹا دینے کا خطرہ باقی نہیں رہا، لیکن دوسرے تمام علاقوں میں ایٹمی جنگ کا خطرہ

بدستور موجود ہے۔ ان ہتھیاروں کے غلط استعمال کا امکان موجود ہے۔ حادثات کا امکان ہے۔ غلط اندازوں کا امکان بھی ہے۔ اسلحے کا پھیلاؤ بھی جاری ہے، اب طاقت کے غلط یا صحیح استعمال کے ضمن میں توازن برقرار رکھنے کا کوئی میکنزم موجود نہیں۔ حکومت کے تمام جدید نظام توازن کے اصول ملحوظ رکھ کر قائم کئے گئے ہیں لیکن اس وقت بین الاقوامی سسٹم میں نہ کوئی تحفظ ہے اور نہ کوئی توازن روایتی نہ غیر روایتی۔ اس نے اسے اور بھی زیادہ خطرناک بنا دیا ہے۔

دہشت گردی کی اصطلاح

س: آپ پاکستان کے انگریزی اخبار ڈان میں ہفتہ وار کالم لکھتے ہیں، اس اخبار نے واحد سپر طاقت کے دور کی دنیا میں یک طرفہ اقدام پر بحث کی ہے۔ 23 اگست 1998ء کے شمارے کے اداریے میں لکھا ہے ''دہشت گردی کی حدود کا تعین کون کرے گا؟ کون یہ فیصلہ کرے گا کہ دہشت گرد کہاں رہتے ہیں؟ امریکہ کے سوا اور کون اس کا جواب دے سکتا ہے؟ امریکہ جو دنیا کی چھت پر بیٹھ کر بیک وقت پولیس مین، جج اور جلاد ہونے کا دعویدار ہے۔(12)

ج: یہ بالکل صحیح ہے، میں پہلے جو کچھ کہتا رہا ہوں، اس سے ذرا مختلف طور پر ہے۔ امریکہ بین الاقوامی نظام کی مکمل خلاف ورزی کرتا آ رہا ہے۔ وہ بنیادی اصول انصاف کے خلاف ہے یہ واحد طاقت ہے جو اپنے آپ کو جج بھی کہتی ہے دوسروں پر الزام بھی دھرتی ہے اور ملزم کو سزا بھی دیتی ہے۔ آپ اپنے نظام میں اس کی اجازت نہیں دیتے ہم بھی اپنے ہاں اس کی اجازت نہیں دیتے لیکن عالمی سطح پر اس کی اجازت دے رہے ہیں۔ میزائیل کے حملے کا معاملہ ہی لے لیجئے۔ اب شہادت موجود ہے کہ خرطوم میں جس ادویہ ساز فیکٹری پر حملہ کیا گیا اس میں کیمیاوی ہتھیار نہیں بنائے جا رہے تھے جو وسیع پیمانے پر تباہی پھیلا سکتے ہوں۔ امریکہ کا کہنا ہے کہ اس کی اینٹلی جنس کا کہنا ہے کہ فیکٹری میں کیمیاوی ہتھیار بنائے جاتے تھے لیکن امریکہ یا کسی بھی دوسرے ملک کی اینٹلی جنس فیکٹری میں تیار ہونے والی ادویات اور کیمیاوی ہتھیاروں میں تمیز کرنے کا دعویٰ کرتی ہے تو وہ سراسر جھوٹ کہتی ہے۔ گذشتہ سال تک فیکٹری میں کام کرنے والے ایک انگریز منیجر کا کہنا ہے کہ فیکٹری میں کوئی ایسی چیز نہیں بن رہی تھی جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہو۔ ایک غیر ملکی کیمرہ مین نے فیکٹری کی فلم تیار کی تھی۔ اس کا بھی کہنا ہے کہ اس نے یہاں کوئی کیمیاوی ہتھیار بنتے نہیں

MashalBooks.org

دیکھے۔(13)

س: آپ نے چند برس پہلے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا ''دہشت گردی کے بارے میں پیش بینی'' اس میں آپ نے کہا تھا کہ اصطلاحات کی تشریح سے آغاز کرنا ضروری ہے۔ (14)

ج: میرے خیال میں سب سے پہلے دہشت گردی کے بارے میں طے کرنا چاہیے۔ کسی کے رویے پر اثر انداز ہونے، کسی کو سزا دینے یا انتقام لینے کے حوالے سے تشدد کا غیر قانونی استعمال دہشت گردی کی تعریف میں آتا ہے۔ ہم دہشت گردی کا اس طرح تعین کریں گے تو سب سے پہلے ہم پر منکشف ہوگا کہ یہ دہشت گردی وسیع پیمانے پر عالمی سطح پر بھی اور نجی سطح پر بھی کی جاتی رہی ہے۔ حکومتوں کی طرف سے بھی اور باغی گروپوں کی طرف سے بھی۔ نجی گروہ کئی زمروں میں آتے ہیں۔ سیاسی دہشت گرد صرف ایک قسم ہے اس کے علاوہ کئی اقسام ہیں۔ جب ہم تشدد کا ذکر کرتے ہیں تو مقصود سیاسی دہشت گردی ہوتا ہے اور جب ہم سیاسی دہشت گردی کا ذکر کرتے ہیں تو پہلی چیز یہ جاننے کی ہوتی ہے کہ اس کے محرکات کیا ہیں اور کون دہشت گرد ہے؟

دہشت کے محرکات کی تحقیق نہ ہونے کے سبب سے سرکاری رویہ یک طرفہ ہو جاتا ہے۔ کم ہی پوچھا جاتا ہے کہ دہشت گردی کیسے پیدا ہوتی ہے۔ امریکی وزیر خارجہ جارج شلز کا کہنا ہے کہ ''دہشت گردی کا کسی محرک سے کوئی تعلق ہونا ضروری نہیں'' دہشت گردی ایک نہایت کریہہ جرم ہے۔ دہشت کی سرکاری اور علمی توجیہات میں غیر قانونی تشدد کو شمار نہیں کیا جاتا۔ ایذا رسانی، دیہات کو نذر آتش کرنا، عوام کو تباہ کرنا، اور قتل عام کرنا دہشت گردی کی تعریف میں نہیں آتا۔ جس کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ دہشت عوام کے خلاف اور حکومتوں کے حق میں ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرکاری اور نجی دہشت پسندانہ سرگرمی میں انسانی نقصانات کی شرح ایک اور ایک ہزار کے درمیان ہے۔ غیر سرکاری دہشت گردی میں اگر ایک جان جاتی ہے، تو سرکاری نوع کی دہشت گردی میں ایک ہزار جانیں ضائع ہوتی ہیں۔

ہم نے اپنے وقتوں میں دہشت گردی کی جو صورت دیکھی ہے وہ یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں میں فسطائی حکومتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ 1970ء اور 1980ء کے عشروں میں اس کی

کئی نظیریں مل جاتی ہیں۔ انڈونیشیا، زائرے، ایران، جنوبی کوریا اور دوسری جگہوں پر فسطائی حکومتوں کو ایک یا دوسری سپر پاور کی پشت پناہی حاصل رہی ہے۔ انہوں نے بڑے وسیع پیمانے پر دہشت پسندانہ تشدد کیا ہے جس کا ماخذ ریاست رہی ہے۔ اس پر حکومتوں کے ذرائع ابلاغ حتیٰ کہ اصحاب علم نے بہت کم توجہ کی ہے۔

مذہبی جوش، دہشت کا اہم سبب رہا ہے۔ دہشت گردی کو مفرد طور پر اسلامی تنظیموں کے ساتھ منسوب اور منسلک کیا جاتا رہا ہے۔ دوسرے مذہبی گروہوں کی دہشت گردی پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ دہشت گردی ایک عالمی مسئلہ ہے۔ یہودی دہشت گرد، اسرائیلی حکومت کی حمایت سے، جسے امریکہ کی حمایت حاصل ہے، مشرق وسطیٰ کے عوام کو دہشت زدہ کرتے رہے ہیں۔ دہشت میں عام لوگوں کا قتل، گھروں کو تباہ کرنا، بچوں کو گولیوں کا نشانہ بنانا اور مساجد میں عبادت گزاروں کو گولیوں سے اڑانا شامل ہے ہیبرون میں بھی یہی کچھ ہوا۔ دوسرے مذہبوں کی دہشت گردی کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے حالانکہ یہودی ازم اور ہندوازم بھی اس کا بڑا سبب رہے ہیں۔ ان لوگوں نے قتل وغارت کی ہے اور ایک کے بعد دوسرا قتل عام کیا ہے۔ انہوں نے مذہب کے نام پر انسانیت کے خلاف جرم کیا ہے لیکن ہماری توجہ یک طرفہ ہے اور ہر پھر کر اسلام ہی کو ہدف تنقید بنایا جاتا ہے۔ دہشت گردی کی عیسائیوں، یہودیوں، ہندوؤں اور بودھوں کی طرز کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یوں دہشت کے بارے میں یک طرفہ فیصلے کئے جاتے ہیں۔

جدید دہشت گردی کے ساتھ کئی صورتیں وابستہ کردی گئی ہیں۔ جہاں تک سیاسی دہشت گردوں کا تعلق ہے جس پر سر دست ساری توجہ مرکوز ہے اس کی بڑی مذمت کی جاتی ہے اور ان کے کاموں پر کھل کر باتیں کی جاتی ہیں۔ حکومت کی طرف سے تحقیق کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ ہے کس غرض سے؟ اگر دہشت گردی کی جڑوں تک رسائی کے لئے چند اسباب کی وضاحت کی جائے تو میں کہوں گا کہ سب سے پہلے دوسروں کا موقف جاننا چاہیے۔ مثال کے طور پر فلسطینیوں نے طیارے اغواء کرنے کا آغاز کیا۔ ایک اعتبار سے یہ ان کی اختراع تھی۔ طیاروں کے اغواء کا سلسلہ 1960ء اور 1970ء کے اوائل میں شروع ہوا۔ تیس برس سے ان کی کوئی شنوائی نہیں ہو رہی تھی۔ انہیں ان کی زمینوں اور ملک سے محروم کر دیا گیا تھا اور کوئی ان کی سننے کے لئے تیار نہیں تھا انہوں نے طیارے اغوا

کر کے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ دہشت کی یہ قسم عرصے سے چلی آنے والی شکایات کے انبار کا متشدانہ ذریعہ تھی اس سے دنیا ان کی بات سننے پر آمادہ ہوئی۔ عام طور پر چھوٹے بے یارومددگار، گروہ جو اپنے آپ کو بے دست و پا سمجھنے لگے ہوں اسی طرح اپنی بات دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔ ویت نامیوں نے کبھی دہشت گردی نہیں کی الجزائریوں نے بھی اس طرح دہشت گردی نہیں کی۔

دہشت گردی غصے کا، بے دست و پائی کا اکیلے اور بے یارومددگار ہونے کا اظہار ہے۔ اور یہ اس وقت کی جاتی ہے جب محسوس کیا جاتا ہے کہ جوابی اقدام کئے بغیر چارۂ کار نہیں۔ آپ کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے اس لئے آپ بھی زیادتی کرتے ہیں۔ بیروت میں ٹی ڈبلیو اے کے جیٹ طیارے کو اغوا کے دوران جیوڈی برادی آف بیلمار نیوجرسی نے کہا کہ وہ مسلسل ''نیوجرسی'' ''نیوجرسی'' کے نعرے بلند ہوتے سنتی رہیں۔ ان کے دل میں کیا تھا، اس نے سوچا کہ وہ مجھے پکڑنا چاہتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دہشت گرد امریکہ کے جنگی جہاز ''نیوجرسی'' کے حوالے سے نعرے لگا رہے تھے۔ اس جہاز نے 1983ء میں لبنان کی شہری آبادی پر سخت گولہ باری کی تھی۔ (15)

ایک اور سبب دغا اور بے وفائی کا احساس ہے جو قبائلی جذبہ انتقام سے تعلق رکھتا ہے، یہ بن لادن ایسے لوگوں کے سلسلے میں سامنے آتا ہے، یہ آدمی کبھی امریکہ کا حلیف تھا امریکہ کو اپنا دوست سمجھتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے ملک پر امریکہ نے قبضہ کر لیا ہے، تو ظاہر ہے اُسے بے وفائی کا احساس ہوا۔ یہاں صحیح یا غلط کے امتیاز کی بات نہیں یہ بتانا مقصود ہے کہ انتہائی تشدد کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

بعض اوقات آپ دوسرے لوگوں کے ہاتھوں تشدد کا نشانہ بنتے ہیں۔ جو لوگ تشدد کا شکار ہوتے ہیں اکثر متشدد بن جایا کرتے ہیں۔ یہودیوں نے منظم صورت میں دہشت گردی، ہٹلر کے جرمنی میں یہودیوں کے خلاف وسیع پیمانے پر ہونے والی قتل و غارت کے بعد شروع کی۔ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ یہودی دہشت گردوں نے زیادہ تر معصوم اور بے گناہ لوگوں کو ظلم کا نشانہ بنایا یا پھر اقوام متحدہ کی طرف سے امن قائم کرنے والے ان کا ہدف ہے۔ سویڈن کے کاؤنٹ برناڈوٹ ان ہی مظلوموں میں شامل ہیں حالانکہ سویڈن نے یہودیوں کے قتل و غارت میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا ارگن یا اسٹرن وغیرہ کے دہشت گرد گروہ

MashalBooks.org

جرمنی کے قتل وغارت کے نتیجے میں سامنے آئے۔تشدد کا شکار ہونے والوں نے ردِعمل میں تشدد کو اپنا شعار بنالیا۔

موجودہ دور میں جدید ٹیکنالوجی اور ذرائع مواصلات کے ذریعے تشدد کے اہداف نے عالمی وسعت اختیار کرلی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تشدد کی گلوبلائزیشن اقتصادی گلوبلائزیشن ہی کا حصہ دکھائی دے گی۔ہم یہ توقع نہیں کرسکتے کہ ہر چیز گلوبلائز ہو جائے لیکن تشدد گلوبلائز نہ ہو۔اس لحاظ سے واضح اہداف ہیں۔طیارے کا اغوا نیا ہے کیونکہ بین الاقوامی سفر مقابلتاً نیا ہے ہر آدمی بندوق کی نالی کے سامنے ہے اس لئے پورے کرۂ ارض کو گولیوں کا ہدف کیا جاسکتا ہے۔

انقلابی نظریے کی عدم موجودگی ہی ہمارے زمانے میں دہشت گردی کے فروغ کا مرکزی سبب ہے۔انیسویں صدی میں مارکسزم اور انارکزم کے درمیان بحث کا ایک نکتہ دہشت کا استعمال بھی تھا۔ مارکسسٹ کہتے تھے کہ انقلابی قتل نہیں کرتا۔انفرادی تشدد سے سماجی مسائل حل نہیں کئے جاسکتے۔سماجی مسائل حل کرنے کے لئے سوشل اور سیاسی تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے۔اس لئے آزادی کی جنگوں اور دہشت پسند تنظیموں کی دہشت گردی میں واضح فرق کرنا چاہیے۔انقلابی نظریہ سردست زیر بحث نہیں۔1980ء اور 1990ء کی دہائیوں میں انقلابی نظریہ پیچھے جا پڑا تھا اور اس نے گلوبلائزڈ فرد کے لئے جگہ کھول دی تھی۔ میں نے عمومی طور پر بات کی ہے، لیکن یہ جدید دور کی دہشت گردی کے محرکات میں شامل ہے۔

س: مشرقی افریقہ کے سفارت خانے پر بمباری اور سوڈان اور افغانستان پر امریکہ کے حملے کے عرصے میں ذرائع ابلاغ نے اطلاع دی کہ دہشت گردوں کی جتھہ بندیوں کو خاموش کردیا گیا ہے۔لیکن جیسا کہ آپ نے پہلے کہا کہ پی ایل او جیسی تنظیم اور جرمنی میں ریڈ بریگیڈ اسپین میں بارسک کے علیحدگی پسند، آئرلینڈ میں آئی آر اے وغیرہ کے سیاسی محرکات تھے۔مذہب کے نام پر جو گروہ میدان میں آگئے ہیں وہ غیر معقولیت پسند ہیں اس لیے زیادہ خطرناک ہیں۔

ج: میں یقین کے ساتھ کہہ نہیں سکتا کہ وہ لازمی طور پر زیادہ غیر معقول ہیں۔آپ مجھے بائیں بازو کے حوالے سے بلکہ بائیں بازو سے اپنے اختلاف کا برملا اظہار کرنے کی اجازت

دیجیئے۔ میرا ایک بڑا مسئلہ 1968ء میں شروع ہوا اور یہ پی ایل او سے متعلق تھا۔ میرا یہ کہنا تھا کہ وہ جس تشدد کا سہارا لے رہے ہیں وہ کچلے اور دبے ہوئے لوگوں کا تشدد ہے۔ یہ کوئی انقلابی تشدد نہیں اس میں بنیادی طور پر کوئی تنظیمی عنصر نہیں ہے، اس کا کوئی اخلاقی اور سیاسی جواز بھی نہیں، اسے حیاتیاتی اور نفسیاتی زمرے میں بھی نہیں ڈالا جا سکتا یہ زیادہ تر ایک جذبے کا اظہار ہے کسی پروگرام کا مظہر نہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ 25 برس بعد تاریخ نے میرے نقطۂ نظر کو صحیح ثابت کر دیا ہے۔ پی ایل او کوئی انقلابی تنظیم نہیں وہ کچلے ہوئے لوگوں کی تنظیم ہے جو غیر انقلابی تنظیم کے ذریعے غیر انقلابی پروگرام کے تحت غیر انقلابی حربے استعمال کر رہی ہے۔ ریڈ بریگیڈز پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔

آئی آر اے کا معاملہ جداگانہ ہے یہ مختلف ماحول میں سرگرم رہی ہے یہی وجہ ہے کہ اتنا عرصہ نکال گئی ہے اور امریکہ اور برطانیہ کو مذاکرات پر آمادہ کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ پی ایل او ایسا نہیں کر سکی۔ پی ایل او تو ہتھیار ڈالنے کو تیار تھی افسوسناک بات یہ ہے کہ اسرائیل نے اس کی شکست قبول نہیں کی۔ اور یہ سب سے بڑا المیہ ہے۔

س: نیویارک ٹائمز کے فریڈ مین نے کہا ہے کہ دہشت گرد امریکہ کے خلاف عمومی نفرت کی بنا پر سرگرم عمل ہیں۔(16) کیا اس قسم کی کارروائیوں کے لئے یہ کہنا کافی ہے؟

ج: تھامس فریڈ مین نیویارک ٹائمز کا کالم نگار ہے اس کی بات کو انٹیلی جنس یا کسی کالم نگار کی گہرائی سے نہیں جوڑا جا سکتا۔ تھامس فریڈ مین اطلاع یا علم کے بغیر لکھتا ہے اس کی بات بے وزن اور اور جاہلانہ ہے اس پر سر کھپانا سراسر تضیع اوقات ہے۔ اس نے اپنے مضمون میں کہا ہے کہ وہ امریکہ سے اس لئے نفرت کرتے ہیں کہ امریکہ امیر کبیر ہے، وہ امریکہ سے اس لئے بھی نفرت کرتے ہیں کہ اس کے پاس ٹیکنالوجی اور سائنس ہے اور ان کے بچے امریکہ کی نقل اتار رہے ہیں یہ بکواس ہے۔ یہ تجزیہ نہیں لفظوں کی جادوگری ہے۔

س: ڈیوڈ اینڈرسن لندن کے سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز کے ایک سینئر لیکچرار ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ جنگ لمبی ہے غالباً کبھی ختم نہ ہونے والی۔ اس میں کئی عوامل شامل ہیں سچ تو یہ ہے کہ پنڈورا باکس کھل گیا ہے جسے بند نہیں کیا جا سکے گا۔ انہوں نے جوابی کارروائی، اس کے جواب میں کارروائی اور آنکھ کے بدلے آنکھ لینے کے حوالے سے یہ بات کی ہے۔ (17)

MashalBooks.org

ج: میں کسی چیز کو تاریخی لحاظ سے مستقل نہیں مانتا۔ تاریخ میں کچھ بھی مستقل نہیں رہا۔ میں تو کہوں گا کہ امریکہ کی طاقت بھی مستقل نہیں یہ خود بڑی عارضی ہے۔ اس لئے یہ جن زیادتیوں کی مرتکب ہوتی ہے وہ بھی مستقل نہیں۔ ان زیادتیوں کے خلاف جو ردِّعمل ہوتے ہیں وہ بھی مستقل نہیں۔ اگر اینڈرسن کی مراد آئندہ پانچ برسوں سے ہے تب تو صحیح ہے لیکن اگر وہ کہیں کہ آئندہ پچاس برس، تو یہ صحیح نہیں۔ امریکہ کئی وجوہ کی بناء پر مشکلات میں گھرا ہوا ہے، ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس کی اقتصادی صلاحیتیں اس کی فوجی صلاحیتوں سے ہم آہنگ نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کے حکمران طبقے کی برتر اور غالب رہنے کی خواہش میں اس کے عوام کی خواہش شامل نہیں۔

س: اس کا ثبوت کیا ہے؟

ج: ثبوت بہت بڑا اور وسیع ہے۔ اگر امریکی عوام دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کے خواہشمند ہوتے تو وہ وہائٹ ہاؤس میں غیر اخلاقی حرکات کے ظاہر ہوتے ہی کلنٹن کو کچل ڈالتے۔ میں بتاتا ہوں کہ کیوں؟ برطانیہ کی اٹھارویں اور انیسویں صدی میں غلبہ حاصل کرنے کی خواہش تھی اس نے چھوٹے چھوٹے جرائم کے ارتکاب پر بھی سلطنت کے مشہور معماروں کو کڑی سزا دی۔ اس نے رابرٹ کلائیو اور وارین ہسٹنگز پر مقدمہ چلایا اور سزا دی اس لئے کہ شاہی سوسائٹی جانتی تھی کہ وہ عالمی سطح پر قابل احترام نہیں سمجھی جائے گی اگر وہ اپنے گھر میں بلند کرداری کا مظاہرہ نہیں کرتی۔ وہ گھر میں راستباز رہے گی تو بیرونی دنیا میں زیادتیاں کر سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ سامراجی ممالک بے عیب سوسائیٹیوں کے حق میں رہے ہیں۔ امریکہ کے عوام اس لئے کلنٹن کا استعفیٰ نہیں چاہتے کیوں کہ وہ انہیں اچھا صدر سمجھتے ہیں وہ ان کے ذاتی کردار اور ان کے کمانڈر انچیف ہونے میں امتیاز کرتے ہیں یہ وہ عوام نہیں جو حکمرانی کرنے کے خواہشمند ہوں۔ وہ تشدد کر سکتے ہیں لیکن غلبہ حاصل کرنے کی خواہش نہیں رکھتے۔

آپ اور مثالیں بھی لے سکتے ہیں۔ غلبہ حاصل کرنے کی خواہش کا مطلب قربانی دینے اور قیمت ادا کرنے پر آمادہ رہنا ہے۔ امریکہ پبلک نہیں چاہتی کہ امریکی لڑکے مریں۔ چنانچہ صومالیہ میں جب امریکی سپاہیوں پر حملہ ہوا تو امریکی وہاں سے نکل آئے اور پاکستانیوں کو ان کا گھٹیا کام کرنے اور ملبہ ہٹانے کے لئے بھیجا گیا۔ امریکی اپنے سپاہیوں کو باہر نہیں بھیجنا

چاہتے وہ بیرونی ملکوں میں مرنا نہیں چاہتے وہ بیرون ملک پر تسلط کے لئے قیمت ادا نہیں کرنا چاہتے۔ سرد جنگ کے دوران، عرصے تک وہ قیمت ادا کرنے پر آمادہ رہے ہیں لیکن اب نہیں، ویت نام کے بعد سے تبدیلیاں آئی ہیں اس اعتبار سے ویت نام والا خوف ابھی زندہ ہے۔

ایران سے رسم وراہ

س: ایران کے صدر محمد خاتمی کو اعتدال پسند سمجھا جاتا ہے۔ امریکہ اور ایران کے درمیان کچھ دروازہ کھلا ہے، ایران میں داخلی سیاست میں اور بیرونی طور پر کیا ہو رہا ہے آپ کا کیا اندازہ ہے؟ کیا یہ امریکہ سے تعلقات کو معمول پر لانے کا اشارہ ہے؟

ج: امریکہ اور ایران کے درمیان ابھی کوئی تعلق قائم نہیں ہوا بس اشارہ کنایہ ہوا ہے۔ امریکی پہلوان ایران گئے ایرانی پہلوان امریکہ آئے بس یہی کچھ ہوا ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان کوئی بنیادی راستہ نہیں کھلا۔ صدر محمد خاتمی کو اندرون ملک قدامت پسندوں کی طرف سے چیلنج درپیش ہے۔ ایران میں دو طرف سے اسلامی سیاست کے درمیان اقتدار کے لئے جدوجہد ہو رہی ہے۔ دونوں اسلام پسند ہیں البتہ ایک دوسرے کے مقابلے میں زیادہ جمہوریت نواز ہے۔ ایک اعتدال پسند ہے دوسرا انتہا پسند۔ ایک اقتدار میں رہا ہے دوسرا نہیں۔

خاتمی نئے ہیں انہیں معاشرتی قوتوں کی حمایت حاصل ہے۔ بباطن بڑی دلچسپ جدوجہد جاری ہے ایران کے یا تیسری دنیا، خاص طور پر کسی بھی اسلامی سوسائٹی کے مستقبل کا مسئلہ ہے شہری سوسائٹی اور ریاست کے تعلق کی نوعیت، کا سوال ہے۔ کلچر کی نوعیت، کلچر اور اقتدار کا تعلق ہے۔ خود طاقت کی نوعیت اور اسے شہریوں اور عوام کے سامنے جوابدہ بنانے کا سوال پبلک کی ذمہ داری اور طرزِ عمل مذہب اور سیاست کا تعلق، زیر بحث ہے۔ ایران میں اقتدار کے لئے موجودہ جدوجہد میں کئی بنیادی مسائل داؤ پر لگے ہوئے ہیں۔

اگر ہم مغربی اصطلاح میں بات کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ صدر خاتمی کا گروپ اقتدار اور شہری سوسائٹی کے درمیان روشن خیال اور لبرل نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ گروپ چاہے گا کہ عورتوں کو قدرے آزادی ملے اور موجودہ اسلامی دور حکمرانی میں ان پر جو پابندیاں لگائی گئی ہیں انہیں نرم کر دیا جائے۔ یہ گروپ تقریر اور اجتماع کی اس سے زیادہ آزادی کا طالب

ہے جتنی آزادی آیت اللہ خامنہ اِی نے دی یا قدامت پسند گروپ دے سکتے ہیں۔ وہ مغربی ملکوں اور امریکہ سے سابق قیادت کے مقابلے میں زیادہ معمول کے تعلقات چاہیں گے۔ ان تمام مسائل حتیٰ کہ ایرانی سیاست کے مجموعی اظہار کے لئے صدر خاتمی کی انتظامیہ نے جو کچھ کیا یہ اس سے آگے کے اقدام ہوں گے۔ لیکن یاد رکھنا چاہے کہ صدر خاتمی کی حکومت انتخابات کے نتیجے میں اقتدار میں آئی ہے۔ ایران آزاد انتخابات کراتا آ رہا ہے سعودی عرب میں ایسا نہیں ہے۔

س: کہا جا سکتا ہے کہ ایران کی اسلامی حکومت ہمسایہ افغانستان میں طالبان کی اسلامی حکومت سے ہمدردی رکھ سکتی ہے اور اُسے مدد دے سکتی ہے۔ لیکن ایسا کوئی معاملہ نہیں ہو رہا۔ ایران افغانستان میں احمد شاہ مسعود کی سربراہی میں قائم شمالی اتحاد کا حامی ہے۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟

ج: اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اسلامی تحریکیں گھڑی گھڑائی اور جامد نہیں ہیں ان کی کئی قسمیں اور طرزیں ہیں ان میں جدید ترین بھی ہیں اور نہایت قدامت پسند بھی، اتنی قدامت پسند کہ پوری اسلامی تاریخ میں ان جیسی کسی حکومت کی مثال نہیں ملتی۔ طالبان کی حکومت واقعتاً اتنی قدامت پسند ہے، اور اعتبار سے پوری اسلامی تاریخ میں وہ اپنی طرز کی آپ ہی ہے۔ وہ جدید دور میں پیدا ہوئے ہیں لیکن بعض معاشرتی خرابی کے نتیجے میں وہ ایسے ہو گئے ہیں۔ ایران کے لئے ان کی ناپسندیدگی اور مخالفت کی فوری وجہ تو یہ ہے کہ ایرانی انہیں اس لئے بھی پسند نہیں کرتے کہ وہ نہیں امریکہ کا ساختہ پرداختہ سمجھتے ہیں۔ امریکہ طالبان کی حمایت کرتا رہا ہے۔

ابھی حال تک یہی کیفیت تھی جیسے ہی اسامہ بن لادن کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے امریکہ ایک بار پھر ان کی حمایت کرنی شروع کر دے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ طالبان فرقہ پرست ہیں وہ کٹر سنی مسلمان ہیں وہ شیعوں سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ بنیاد پرست کیتھولک عیسائیوں کی طرح ہیں جو پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے سخت مخالف ہیں دونوں مذہبی حکومتیں قائم کرنا چاہتے ہیں، ظاہر ہے دونوں کے درمیان جھگڑا اور کشمکش تو ہو گی۔

س: حال ہی میں امریکہ کے تجارتی اداروں کی طرف سے کئی اشتہارات اور مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں ایران پر پابندیاں لگانے اور ایران کو الگ تھلگ کرنے کی پالیسی کی

مذمت کی گئی ہے۔ خاص طور پر امریکہ کے تیل، گیس اور کیمکلز کے کثیر القومی ادارے کوشش کرتے آرہے ہیں کہ حکومت اپنے موقف پر نظر ثانی کرے۔ آپ کا اس خصوصی صورتحال کے بارے میں کیا خیال ہے؟ دکھائی دیتا ہے کہ یہ نظریہ تجارتی مفادات کی نمائندگی کرنے لگا ہے؟ عام طور پر تجارتی مفادات کو بالادستی حاصل ہوتی ہے لیکن یہاں کئی امریکی حکومتیں ایران کی سفارتی علیحدگی کو زیادہ اہمیت دیتی آئی ہیں اور اس کی اقتصادی لاگت بھی ادا کرنے کے لئے تیار رہی ہیں۔

ج: یہ ایک دلچسپ مسئلہ ہے یہ بائیں بازو کی گھڑی ہوئی ایک بات ہے۔ بعض اوقات غیر تجارتی مفادات تجارتی مفادات کے مقابلے میں اچھے رہتے ہیں۔ اس کی ایک اچھی مثال 1940ء اور 1950ء کے عشروں میں چین کی لابی تھی، جس نے امریکہ کو چین میں آنے سے روکے رکھا۔ 25 برس بعد اب کہیں جا کر امریکہ کو چین میں آنے کا موقعہ ملا ہے، اگر پہلے بھی یہ ہو جاتا تو کوئی حرج نہ ہوتا کیونکہ چین کو اس کی حدود میں بند رکھنا امریکہ کے مفاد میں نہیں تھا۔

یہی کچھ کیوبا کے ضمن میں ہو رہا ہے۔ کئی امریکی کمپنیاں کیوبا میں جانا چاہتی ہیں یہ امریکی ساحل سے صرف 90 میل دور ہے اس میں خواندگی کی شرح 95 فیصد ہے۔ اس کے پاس ماہر لیبر فورس اور تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ ہے یہاں لیبر بہت سستی ہے اس حوالے سے برآمدات کے مرکز کی حیثیت سے بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ لیکن کیوبا کی لابی کے سبب سے دروازہ بند ہے۔ یہ لابی بہت طاقتور ہے یہ کانگرس کے ارکان کو رشوت دیتی ہے اس کی سیاسی ایکشن کمیٹیاں ہیں۔

یہی بات ایران پر بھی صادق آئی ہے۔ اسرائیلی حکومت نے ابھی تک ایران کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ ایران مشرق وسطیٰ کا ایک بڑا ملک ہے جسے بیت المقدس پر اسرائیل کا قبضہ قبول نہیں۔ اس لئے اسرائیل کہتا ہے کہ ایران خطرناک ہے، اسے الگ تھلگ ہی رکھا رہنے دو۔ میرے خیال میں اسرائیلی لابی نے ایران کو الگ تھلگ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

س: نیویارک ٹائمز نے اپنے پہلے صفحے پر ایران کے بارے میں خبر شائع کی کہ اس نے درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے میزائیل کا تجربہ کیا ہے اور یہ میزائیل اسرائیل اور سعودی عرب

کونشانہ بنا سکتا ہے۔(18)اس ضمن میں ترکی پاکستان یا افغانستان کا نام بھی لیا جاسکتا تھا لیکن نہیں لیا گیا۔کیوں؟

ج: اس لئے کہ اسرائیل امریکہ کا جنگی اتحادی ہے اور سعودی عرب کی اپنی فوجی اہمیت ہے۔ ایسی بات کہہ کر وہ رائے عام ہموار کررہے ہیں، امریکی عوام کو پروا نہیں ہے کہ ایران پاکستان کونشانہ بناتا ہے یا نہیں اسے سعودی عرب اور اسرائیل کونشانہ بنانے پر پریشانی ہوتی ہے حالانکہ ایران کو سعودی عرب اور اسرائیل کونشانہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

س: آپ نے تجارتی مفادات بمقابلہ غیر تجارتی مفادات کی بات کی ہے۔ گوئٹے مالا میں یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کا وہاں بڑا کاروبار تھا اس نے1954ء میں وہاں بغاوت کرائی۔

ج: میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا ہے، اصول یہ ہے کہ تجارتی مفادات اپنا راستہ خود بناتے ہیں، ان کے پریشر گروپ مضبوط ہیں کبھی ایسی صورت حال پیدا ہوجاتی ہے کہ ایک مضبوط پریشر گروپ اپنے لئے ثقافتی جواز پیدا کرلیتا ہے اس سے ریاست کے زبانی کلامی دعوؤں اور پریشر گروپ کے درمیان میل ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر امریکی افسر شاہی40 برس سے کیوبا کو بُرا کہہ کر پیش کرتی آئی ہے ذرائع ابلاغ اس کی تائید کرتے آئے ہیں اس کے ساتھ ایک لابی بن گئی۔ یہ بعض اعتبارات سے بہت مضبوط ہے اس کا صرف ایک مقصد ہے کہ کیوبا اور امریکہ کے درمیان معمول کے تعلقات قائم نہ ہونے پائیں۔

ترکی اور اسرائیل

س: ترکی میں رونما ہونے والے حالیہ واقعات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ یہ بعض اسلامی اور سیکولر تنظیموں کے درمیان کشمکش کا نتیجہ دکھائی دیتے ہیں۔

ج: اسی برس ہوئے ترکی نے اپنے آپ کو یورپی ملک ہونے کا اعلان کیا تھا۔ ان اسّی برسوں میں ترکی کا مشرق وسطیٰ سے الگ تشخص قائم ہوا ہے۔ اس کا حکمران طبقہ مشرق وسطیٰ کا حصہ بننا نہیں چاہتا۔ اس لئے ترکی اسرائیل سے اتحاد کرنے کی کوشش میں لگا رہا ہے۔ دوسری طرف عوام جانتے ہیں کہ حقیقت میں وہ یورپی نہیں ہیں۔ یہ بات وہ آج پہلے سے زیادہ تسلیم کرنے لگے ہیں۔ ترکی میں اسلامی تحریک نے جڑ پکڑ لی ہے۔ یہ ایک مضبوط تحریک ہے۔ درحقیقت اس نے اقتدار بھی حاصل کرلیا تھا۔ اُسے فوج نے مداخلت کرکے

محروم اقتدار کیا۔ ترکی ایک بٹا ہوا ملک ہے آدھا یورپ میں، آدھا مشرق وسطیٰ میں، دونوں کے درمیان جو رخنہ ہے اسے پُر کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔

س: ترکی کے اسرائیل کے ساتھ فوجی اتحاد میں کیا منطق ہے؟

ج: منطق یہ ہے کہ اس وقت ترکی امریکہ کا ایک بڑا حلیف ہے اور اسے امریکی امداد حاصل ہے۔ منطق عربوں کا گھیراؤ کرنا ہے۔ عرب اس وقت صحیح معنوں میں محصور ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی واضح کر رہے ہیں کہ وہ محصور نہیں رہنا چاہتے امریکہ ڈرتا ہے کہ وہ اٹھ کھڑے ہو سکتے ہیں یا وہ مزاحمت کرنا سیکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے مزاحمت کی تو امریکہ کو انہیں زیر کرنے کے لئے مضبوط پولیس مین چاہیے ہوں گے۔ اسرائیل اور ترکی اس کے بہت اچھے حلیف ہیں۔

آرمینی باشندوں کی نسل کشی

س: 1915ء میں عثمانی ترکوں نے آرمینیا میں جو قتل عام کیا اسے بیسویں صدی کا پہلا قتل عام کہا جاتا ہے، لیکن ترک حکومتیں آج تک اس کی تردید کرتی آئی ہیں۔

ج: آپ مجھ سے اس پر اختلاف کر سکتے ہیں لیکن میرا خیال نہیں کہ یہ قتل عام عثمانی ترکوں نے کیا۔ آرمینیا کے لوگوں کا قتل عام ترک نیشنلزم کا پہلا اظہار تھا خلافت موجود تھی عثمانی خلیفہ ابھی حکومت کر رہے تھے لیکن انہوں نے عثمانی حکمران بننا چھوڑ دیا تھا اور وہ ترک نیشنلسٹ بن رہے تھے۔ اس سبب سے انہوں نے مشرق وسطیٰ کھو دیا، عربوں کی وفاداریاں کھو دیں، کیونکہ وہ نیشنلزم کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ آرمینیا کے لوگ اس وقت تک ترک خلاف کے ساتھ مقابلۃً تحفظ کی زندگی بسر کرتے آئے تھے۔ ترکی میں نیشنلزم نے جڑ پکڑی تو آرمینیائی لوگوں کا ترکی سے نظریاتی اختلاف ہو گیا۔ قوم پرست نظریے کی رو سے جو شخص خونی اور نسلی ترک نہیں وہ غیر ترکی ہے، انہیں اس لئے مارا گیا کہ وہ آرمینیائی تھے، اس لئے نہیں کہ وہ عیسائی تھے۔ آرمینیا کے لوگ اپنے آپ کو مشرق وسطیٰ میں نیشنلزم کا پہلا شکار سمجھتے ہیں۔ خدا کرے گرد مشرق وسطیٰ میں نیشنلزم کے ابھار کا آخری شکار ہوں۔

س: پرنسٹن یونیورسٹی نے ترک حکومت کے مالی تعاون سے ترکی کی تاریخ کے بارے میں الگ چیئر قائم کی ہے اس کا اہم ترین مقصد آرمینیا کے لوگوں کے قتل عام کی تردید کرنا ہے۔

ج: کیا یہ واقعی سچ ہے؟ میں اس ضمن میں یہی کہہ سکتا ہے کہ پرنسٹن یونیورسٹی نے یہ ایک اور ایسا

کام کیا ہے جس پر میں شرمندہ ہوں۔ میرے خیال میں ترک عوام اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنی تاریخ خاص طور پر اپنی جدید تاریخ سے جس میں آرمینیائی لوگوں کے قتل عام کا احوال بھی ہے، آشنا نہیں ہو جاتے۔ یہ کہنا کہ یہ خانہ جنگی تھی یہ کہنے کے مترادف ہے کہ ترک عوام کو اکثریت حاصل نہیں تھی۔ یہ کہنے کے بھی مترادف ہے کہ اقتدار ترکوں کے پاس نہیں چند ہاتھوں میں تھا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اکثریت بھی ان کی تھی اور علاقہ بھی انہی کا تھا وہ اسے خانہ جنگی کہہ کر نکل نہیں سکتے۔ وہ یہ تسلیم کر کے ہی بڑے اور عظیم لوگ بن سکتے ہیں جیسا کہ میرے خیال میں جرمنوں نے اپنے آپ کو بڑا ثابت کیا ہے کیونکہ انہوں نے عالمی جنگ کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ اسرائیلی بھی یہ تسلیم کر کے کہ انہوں نے فسلطینیوں کے خلاف جرم بہت بڑا جرم کیا ہے بڑے آدمی بن سکتے ہیں۔ آرمینیا کے لوگوں کے ضمن میں ترک بھی اعتراف حقیقت کر کے اپنی بڑائی کا ثبوت دے سکتے ہیں۔

س: آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بعض اسرائیلیوں کو مضطرب کر دے گا کیونکہ آپ آرمینیا کے لوگوں کا قتل عام دوسری جنگ عالمگیر اور فلسطینیوں سے اسرائیل کے سلوک کو مساوی حیثیت دے رہے ہیں۔

ج: یہ عوام کی تباہی کا سوال ہے۔ میں امریکی انڈینز کے ساتھ امریکہ کے سلوک کا ذکر کر سکتا تھا۔ میں بھول گیا کہ یہ میری کوتاہی ہے۔ امریکی صرف یہ کہہ سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ اپنے حق میں کہنا چاہیں کہ انہوں نے ایسا ایک وقت میں اور خاص موقعہ پر نہیں کیا۔ اسرائیلی صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے گیس چیمبر نہیں بنائے لیکن انہوں نے لوگوں کی زمینیں چھین لیں ان پر پانی بند کر دیا ان کا کلچر تباہ کر دیا اور وہ یہ سب کچھ اب بھی کر رہے ہیں۔ ایک قوم کے لوگوں سے ان کی زمینیں چھین لی جائیں ان پر پانی بند کر دیا جائے اور ان کی ثقافت تباہ کر دی جائے تو وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ فلسطین میں اسرائیلیوں نے یہی کیا۔ یہ صحیح ہے کہ اتنا خون نہیں بہا، جو سر کاٹے گئے ان کی تعداد بھی اتنی نہیں تھی لیکن مادر وطن سے محرومی یا ایک قوم کو اس کی سرزمین سے محروم کر دینا یہ تو ہوا۔ بدقسمتی سے یہ آج بھی ہو رہا ہے۔ ہاں میں جانتا ہوں کہ اسرائیلیوں اور آرمینیا کے لوگوں کو اس موازنے پر غصہ آئے گا اور وہ دانت پیسیں گے لیکن یہ حقیقت ہے۔ آرمینیا کے لوگ مجھے مشرق وسطیٰ، بالخصوص فلسطین اور لبنان میں ملے وہ فلسطینیوں کے پرزور حامی تھے اپنی چھٹی حس کی بناء پر فلسطینیوں کے حق

میں تھے کیونکہ وہ بباطن جانتے تھے کہ وہاں یکسانیت نہیں یہ چاروں معاملے یکساں نہیں ان میں یہ مشابہت ہوسکتی ہے کہ وہ ایک ہی خطے میں ہیں لیکن ان میں سے ایک مرتفع سطح پر ہے دوسرا نچلی سطح پر ہے علاقہ ایک ہی ہے۔

س: صیہونیت کے بارے میں آپ کے خیالات کی تشکیل میں آپ کی ان آراء کو دخل ہے جو آپ نے ''الگ تھلگ رہنے کی مخالفت'' اور ''قومی شعور کے خطرات'' کے ضمن میں ظاہر کی تھیں۔

ج: میں نے اس سے پہلے مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو کے نیشنلزم کی تعریف کی تھی۔ کیونکہ انہوں نے ہندوستان کو ہندو بھارت کے طور پر اپنی منزل نہیں ٹھہرایا تھا۔ جہاں نہ مسلمانوں کے لئے کوئی جگہ ہو اور نہ عیسائیوں کے لئے۔ اسرائیل میں فلسطینیوں کی اکثریت کو باہر دھکیل دیا گیا جو باقی بچے ہیں وہ مقبوضہ لوگ ہیں۔ انہیں حقوق شہریت تو مل گئے ہیں لیکن انہیں تیسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے انہیں مکمل شہری حقوق حاصل نہیں۔ آپ کسی امریکی یہودی سے پوچھیں کہ کیا وہ ان حالات میں امریکہ میں رہنا پسند کرے گا جن حالات میں عرب اسرائیل میں رہ رہے ہیں؟ اس کا جواب نفی میں ہوگا، آپ یہ نہ کہیں کہ میں اسرائیل سے موازنہ کر رہا ہوں بصورت دیگر اس کا جواب بدل جائے گا۔ فرض کریں کہ بحیثیت یہودی آپ کی جائیداد پر حکومت قبضہ کر لیتی ہے لیکن عیسائیوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ یہودی مسلح افواج میں بھرتی نہیں ہوسکتے مکان، تعلیمی وظائف، بہبود عامہ اور ان زمینوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے جو عیسائی چھوڑ گئے ہیں۔ اس حالت میں کیا آپ امریکن شہری کہلا سکیں گے؟ اس کا جواب نہیں میں ہوگا۔ یہ کوئی خصوصی سلوک برتنے والی نہیں بلکہ نسل پرست ریاست ہوگی۔

اعتقاد سے ماورا:۔ وی، ایس نائی پال

س: وی ایس نائی پال 1932ء میں ٹرینی ڈاڈ میں بس جانے والے ہندوستانی خاندان میں پیدا ہوا۔ 1950ء میں انگلستان چلا گیا جب سے وہ وہیں رہ رہا ہے۔ وہ خاصا مشہور ناول نگار ہے۔ حال ہی میں اس کے دو ناول ''صدی کے ایک سو بہترین ناولوں'' میں شامل کئے گئے ہیں۔ اسے سر کا خطاب مل چکا ہے وہ فکشن کے علاوہ بھی لکھتا ہے۔(20) 1998ء میں اس نے کتاب "Among the Believers" لکھی یہ اسلامی ملکوں کا سفرنامہ ہے پبلشر کے مطابق اس کتاب کو عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔(21)

1995ء میں نائی پال نے انڈونیشیا، ایران، پاکستان اور ملائشیا کا سفر کیا اس کی تازہ ترین کتاب "Beyond Belief" ہے اس میں اس سفر کے احوال ہیں۔ نائی پال نے دیباچے میں لکھا ہے:

''اسلام اپنے ماخذ کے لحاظ سے عرب مذہب ہے۔ عربوں کے سوا جس نے بھی اسلام قبول کیا وہ نومسلم ہے۔ اسلام محض ضمیر یا ذاتی عقیدے کا معاملہ نہیں اس کے کچھ سامراجی تقاضے بھی ہیں۔ اسلام قبول کرنے والے کا عالمی نقطۂ نظر بدل جاتا ہے۔ اس کے مقدس مقامات عرب زمینوں پر ہیں۔ اس کی مقدس زبان عربی ہے۔ اس کا تاریخ سے متعلق نظریہ بدل جاتا ہے۔ وہ اپنی نفی کر دیتا ہے اور وہ چاہے یا نہ چاہے عرب داستان کا حصہ بن جاتا ہے۔ نومسلم کے لئے لازم ہے کہ وہ ہر اس چیز سے الگ ہو جائے جو اس کی اپنی ہے۔ اس سے معاشروں میں جو فساد پیدا ہوا ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی یہ فساد اور اختلاف ختم نہیں ہوا، اپنی اصلیت سے الگ ہونے کا عمل بار بار دہرایا جاتا ہے۔ لوگوں نے اپنے بارے میں کہانیاں گھڑ لی ہیں کہ وہ کون ہیں، وہ کیا ہیں؟ نومسلم ملکوں میں اعصابی فساد اور اخلاقی پستی کا عنصر موجود ہے۔ ان ملکوں کو بڑی آسانی کے ساتھ اشتعال دلایا جا سکتا ہے۔ (22)

نائی پال کے اس جائزے کے بارے میں کیا رائے ہے۔

ج: میرے خیال میں آپ نے اس مسئلے کی نشان دہی کی ہے Beyond Belief کے دیباچے کے تعارفی پیرے میں قدرے طوالت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ جن ملکوں میں نائی پال گئے وہاں اسلام نومسلم لوگوں کا ہے۔ وہ اسلام کو ''عرب مذہب'' کہتے ہیں۔ جو شخص عرب نہیں وہ نومسلم ہے۔ نومسلم کا نظریہ مسخ شدہ اور خلاف مذہب ہے۔ اس سے فساد اور انتشار پیدا ہوتا ہے۔ یہ اعصابی فساد کی کیفیت ہے۔ اس اعتبار سے مرکزی خیال نومسلموں پر مذہب کے اثر کے بارے میں ہے۔ پوری کتاب میں نائی پال پاکستان یا ملائشیا میں ایک ہی مسئلے کی موجودگی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مسئلہ اس لئے ہے کہ لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک مقام پر وہ لکھتا ہے کہ قدیم شہر لاہور میں بعض اہم ترین تاریخی عمارات کو مجرمانہ طور پر نظر انداز کیا گیا ہے اور پوچھتا ہے کہ عوام ورسائے (فرانسیسی شہر) کی طرح کی عمارتوں کو نظر انداز کرنے کی کیسے

MashalBooks.org

اجازت دے سکتے ہیں؟ یعنی ان لوگوں کا اپنی تاریخ سے کوئی رشتہ نہیں۔ نومسلم اپنے ماضی کا خیال نہیں کرتے یہ نائی پال کا اخذ کردہ نتیجہ ہے، لیکن افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ تاریخی عمارات اور آثار کو بھارت پاکستان کمبوڈیا، مصر، اردن، افریقہ، لاطینی امریکہ، بلکہ پوری دنیا میں نظرانداز کیا جارہا ہے کئی یورپی ملکوں اور امریکہ میں بھی ان آثار پر توجہ نہیں کی جارہی ہے وہاں نومسلموں کا عمل دخل کہاں ہے؟ اس لحاظ سے اس کا مرکزی خیال ہی غلط ہے۔

ایک اور مسئلہ ہے جو زیادہ بڑا ہے۔ کون نومسلم یا نومذہب نہیں؟ جو معیار نائی پال نے قائم کیا ہے اس کے مطابق اگر ایرانی نومسلم ہیں تو پھر امریکی نوعیسائی ہیں جاپانی اور چینیوں کی اکثریت نوبودھوں کی ہے۔ ہر کسی نے دوسرا مذہب اختیار کیا ہے کیونکہ ہر بڑے مذہب کے پیروکار شروع میں چند ہی ہوئے تھے۔ اس اعتبار سے عیسائیت، اسلام اور بدھ مت، خاص طور پر تمام پیغمبری مذاہب لوگوں کو اپنے اندر شامل کرتے رہے ہیں اور اسی طرح فروغ پاتے رہے ہیں اور یوں تبدیل شدہ انسانیت پیدا کرنے کا سبب رہے ہیں نائی پال کے خیال سے کوئی بھی باہر نہیں۔ اس لئے اس پر وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

دی ایس نائی پال ایک ایسا شخص ہے جسے خیالی اور اپنے ہی تخلیق کردہ آسیب ڈراتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی حقیقی نہیں وہ غیر متوقع طریقوں سے اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ یہ کتاب اسلام کے بارے میں ہے لیکن اچانک پاکستان کے متعلق باب میں اس کا بڑا حصہ وہ ایک خاص آدمی کے لئے مختصر کردیتا ہے جسے وہ شہباز کہتا ہے برطانیہ میں تعلیم پانے والا یہ پاکستانی نوجوان آکسفورڈ اور کیمرج کے زمانے میں کارل مارکس، دی آئی لینن اور سب سے بڑھ کر چی گویرا دریافت کرتا ہے۔ وہ گھر واپس آتا ہے اور لاطینی امریکہ، افریقہ، مشرق وسطیٰ یا امریکہ کے نوجوان کی طرح وہ بائیں بازو کے ایک گروپ میں شامل ہوجاتا ہے اور پایانِ کار بلوچستان میں بائیں بازو کے مسلح نوجوانوں کا ساتھ دیتا ہے۔ نائی پال اس شخص کا بڑی تفصیل سے ذکر کرتا ہے وہ اسے ایسے پیش کرتا ہے جیسے وہ نوجوانوں کی بگڑی ہوئی شکل ہو۔ میں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ وہ بگڑی ہوئی شکل ہے یا نہیں لیکن وہ اسے ایسا ہی پیش کرتا ہے کہ وہ بائیں بازو کی بغاوت کے جھمیلوں میں پڑ جاتا ہے۔ بغاوت ناکام رہتی ہے اس کے دوست مرجاتے ہیں اور وہ معمول کی زندگی کی طرف واپس آجاتا ہے۔

اس پورے باب میں کہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ شہباز راسخ العقیدہ مسلمان ہے اور اس کی زندگی

میں اس کی تعلیم اس کی سوچ اور اس کی کہانی میں اسلام کا کوئی کردار ہے جس پر نائی پال 35 صفحے صرف کر رہا ہے؟ وہ نوجوان صرف اس وجہ سے موضوع بنا ہے کہ نائی پال کو ہر لیفٹسٹ سے نفرت ہے۔ اُسے اپنا ایک اور بھوت دریافت کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ وہ اپنے خدشات، نفرت اور مایوسی کو تے کر کے نکال دینا چاہتا ہے۔

اس کا ایک اور پہلو بھی ہے جو اس قسم کے نسل پرست مستشرق کے لئے خاص ہے۔ نائی پال نے اپنے دوستوں ہی کو کاٹ کھایا ہے۔ اس کتاب کا شہباز میرا دوست احمد رشید ہے جس نے نائی پال کو اس کے چھ ہفتوں کے پاس کے دورے میں ذاتی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرایا اسے سیر کرائی اور مجھ سمیت کئی لوگوں سے اس کا تعارف کرایا۔ احمد رشید حماقت کی حد تک فیاض شخص ہے۔ اس نے نائی پال کے کام میں مدد دینے کے لئے اپنے بہت سے کام چھوڑ دیئے۔ نائی پال نے اس کا کیری کیچر بنا کر اس کا حساب برابر کر دیا ہے۔ اس نے اُس کا نام بدل دیا ہے لیکن صرف اس طرح کہ ہر پڑھا لکھا پاکستانی احمد رشید کو پہچان لے گا اور ایک مردم خور سے دوستی کرنے پر اس سے ہمدردی کرے گا۔ یہ کہتے مجھے خوشی نہیں ہو رہی ہے کہ نائی پال ایک بہت ہی بیمار شخص ہے۔ یہ کتاب واقعی عقیدے سے ماورا ہے کیونکہ اسے آسیب کے خوف نے پیدا کیا ہے۔ اسلام بھی اس کا آسیب ہی ہے۔ وہ کیپٹن اہاب ہے۔

س: اسلام اس کی سفید ویل ہے؟

ج: اسلام واقعی اس کی سفید ویل مچھلی ہے اور وہ حقیقتاً اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اہاب کا ویل کے پیچھے پڑنے کا ایک سبب تھا۔ وہ یہ کہ ویل نے اسے زخمی کیا تھا میرے علم کے مطابق نائی پال کو اسلام یا مسلمانوں سے کبھی کوئی گزند نہیں پہنچی۔ اس کے باوجود وہ اس کے اعصاب پر سوار ہے۔

س: آپ کی نائی پال سے ملاقات کیسی رہی؟ اس نے آپ کو کیسے گھیرا۔

ج: اس نے مجھے نہیں گھیرا میں اُسے کئی بار ملا۔ آغاز اس کی طرف سے ہوا تھا۔ لیکن اس نے مجھے نہیں گھیرا۔ مجھے حیرت ہے کہ کیوں نہیں گھیرا۔ میرا خیال ہے کہ میں اسے کسی ایسے شخص کی طرح دکھائی نہیں دیا جو اس کے لکھنے کے لئے کوئی موضوع بنتا۔ دوسرے اس نے مجھ سے پوچھا کہ میرا اس کی کتاب Among the Believers کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں

نے کہا کہ مجھے وہ کتاب پسند نہیں آئی۔اس نے پوچھا کیوں؟ میں نے کہا اس لئے کہ تم حقائق سے دلچسپی نہیں رکھتے۔اس طرح کی کتابیں افسانوی نہیں ہوتیں۔میں ان کتابوں کو حقیقت کی تلاش کے لئے پڑھتا ہوں۔وہ سخت مشتعل ہو گیا اس نے کہا تمہارا کیا مطلب ہے، کیا میں حقیقت سے دلچسپی نہیں رکھتا؟ میں تو اس کے بارے میں لکھتا ہوں۔میں نے کہا تم نے اس کتاب میں پاکستان پر ساٹھ صفحے لکھے ہیں اور پاکستان کو فوجی ڈکٹیٹر ضیاءالحق کی سربراہی میں اسلامی ریاست قرار دیا ہے۔حالانکہ اس شخص نے ایک جامد اور موت کی سی خاموشی والی حکومت قائم کر رکھی تھی۔تم نے بتایا ہے کہ اس حکومت نے ملک کی نمائندگی کی ہے اور عوام نے اس کی حمایت کی ہے۔یہ تمہاری ذمہ داری تھی کہ کم سے کم یہ اطلاع دیتے اور بتاتے کہ ہزاروں لاکھوں لوگوں نے جان کا خطرہ مول لے کر اس حکومت کی مخالفت کی۔تمام معروف شاعر ادیب اور آرٹسٹ اس کی مخالفت کرنے والوں میں شامل تھے۔ہمارے بہترین ادیب جیلوں میں بند تھے یا جلا وطن کر دیئے گئے تھے۔کئی لوگوں کو سرعام کوڑے مارے گئے تیس سے چالیس ہزار افراد جیلوں میں گئے۔تم نے ان کا ایک بار بھی ذکر نہیں کیا۔تم نے اس حکومت کو اسلامی کہا ہے تم کم سے کم یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ متنازعہ مسئلہ ہے جو اسلام تم پیش کر رہے ہو یہ مسلمانوں کا اسلام نہیں۔پاکستان کے بے شمار لوگوں بلکہ اکثریت نے اس کی سخت مخالفت کی ہے۔

درحقیقت یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اقبال کے بعد اردو کے سب سے مشہور شاعر فیض احمد فیض جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے ایک دوسرا مشہور شاعر حبیب جالب قید میں تھا لندن سے آنے والا ایک سنجیدہ ادیب ضیاءالحق کی حکومت کو اور اس سوسائٹی کو جو وہ بنا رہا تھا اسلامی قرار دے اور یہ نہ بتائے کہ ہم یا تو جیلوں میں پڑے تھے یا جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔اسے لکھنا نہیں کہتے،اسے لکھنا چھوڑ دینا چاہیے بہتر ہے وہ کباب بیچنا شروع کر دے۔

گارڈز کی تبدیلی

س: آپ نے لکھا ہے کہ ”نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد نوآبادیاتی کلچر نے جس مضبوطی کے ساتھ پاکستان اور ہندوستان کو اپنے پنجوں میں جکڑا ہے وہ سوچنے کی بات ہے“ اس کے برقرار رہنے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ نوآبادیاتی نظام کے بعد آنے والی اشرافیہ ایسی متبادل اقدار اور اسلوب پیدا کرنے میں ناکام رہی جس پر نئے کلچر کی بنیاد رکھی جا سکتی۔“

(23)

ج: نوآبادیات کے بعد کی ریاست نوآبادیاتی ریاست کا خراب عکس ہے، اس کا وہی ڈھانچہ ہے جس میں طاقت مرکز میں مرکوز ہے۔ بیوروکریسی غالب اور بالا ہے فوج اور جاگیرداروں میں اتحاد موجود ہے۔ ڈھانچہ پرانا تھا مسائل نئے پیدا ہوگئے۔ پرانا نظام کام نہیں کرسکتا تھا۔

نوآبادیاتی ریاست عوام کی خدمت کے لئے نہیں تھی یہ استحصال کے لئے اور وسائل کو لوٹنے کے لئے تھی۔ مابعد نوآبادیاتی ریاست بالکل اپنی پیش روہی کی طرح ہے یہ اہل دانش ہوں یا بورژوائی جو تیسری دنیا میں جائیدادوں کی مالک ہیں غریبوں کے حالات سے بے خبر ہیں۔ وہ ایسے ہی سنگدل ہیں بلکہ بعض صورتوں میں نوآبادیاتی ریاست سے بھی کہیں بڑھ کر سنگدل۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں کی حالت تباہی کے قریب پہنچ گئی ہے ایسے اہل دانش جن کا تعلق اس سرزمین سے ہوتا اور وہ ملک کے مسائل سے آگاہ ہوتے ان میں کچھ احساس ذمہ داری ہوتا اور وہ جان سکتے کہ عوام کے ساتھ کیا ہو رہا ہے پیدا ہی نہیں ہونے دیئے گئے۔ اب وہ اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے امریکی یونیورسٹیوں میں بھیج رہے ہیں۔ بالکل کچھ زمانہ پہلے والے ایرانیوں کی طرح۔1979ء میں ایران میں انقلاب آیا تو اس وقت ساٹھ ہزار ایرانی طلباء امریکہ میں پڑھ رہے تھے۔ پندرہ سے بیس ہزار پاکستانی طلبا بھی اب امریکہ میں زیر تعلیم ہیں۔ ان میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ متوسط طبقے کے دانش وروں کا بھی عوام کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں رہا وہ نسل پرستی کا ایک ایسا نظام قائم کررہے ہیں جس میں غریبوں کو امیروں سے الگ کردیا گیا ہے اور امیروں کا تعلق مغرب سے جوڑ دیا گیا۔ یہ بہت خراب صورتحال ہے مجھے اُمید ہے کہ یہ حالت بدلے گی۔ میں کوئی ایسی مایوس کن تصویر پیش نہیں کرنا چاہتا کیونکہ ایسے لوگ ابھی موجود ہیں جو حالات کا رُخ موڑنے کا جتن کررہے ہیں۔ وہ تعداد میں کم ہیں لیکن وہ کوشش کررہے ہیں۔

س: ییٹس نے اپنی نظم Great Day میں وہی کچھ لکھا ہے جو کچھ آپ بیان کررہے ہیں ''گداؤں نے جگہ بدلی لی ہے لیکن کوڑے برس رہے ہیں'' آزادی کے بعد بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔ کیا فرانز فینن نے نہیں کہا کہ محض ایک پولیس مین کی جگہ دوسرا پولیس مین لے آنا آزادی نہیں۔(24)

ج: مجھے صحیح طرح یاد نہیں کہ فینن نے کیا کہا ہے یہ اس کی دلیل ہوسکتی ہے لیکن جب تک ہم ایسے متبادل نظام کا نہیں سوچتے جو عوام کو طاقت اور اقتدار بخشے اور جب تک کہ اقتصادی ترقی کے لئے متبادل منصوبے نہیں بناتے اس وقت تک مستقبل تاریک رہے گا۔ نوآبادیاتی نظام ختم کئے جانے کے پچاس سال بعد ہم یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ یہ ضروری اقدام تو تھا لیکن کافی نہیں تھا، ہم ضروری سے کافی حد تک کا سفر طے نہیں کر سکے۔

س: پنانگ (ملائیشیا) میں قائم تھرڈ ورلڈ نیٹ ورک کی طرح کے گروپوں کا کہنا ہے کہ نام نہاد آزاد تجارت کے معاہدوں، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور عالمی بینک کی میکنزم کے ذریعے اجارہ دار طاقتوں نے سابق نوآبادیات کو پھر سے نوآبادیاتی قبضے میں لینا شروع کر دیا ہے۔

ج: مجھے اس سے اتفاق ہے۔ لیکن ایک مشکل ضرور درپیش ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ ہم اس چکر کوئی شکل دیتے رہتے ہیں جس میں ہم طویل عرصے سے پھنسے ہوئے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہم پھر سے نوآبادیاتی نظام کی بحالی کے عمل میں سے گزر رہے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ابھی ہم نوآبادیاتی نظام کی گرفت سے آزاد ہونے کے عمل میں ہی پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکے۔ میرا ملک پاکستان ایک بڑا ملک ہے اب اس کی آبادی چودہ کروڑ ہے برطانیہ نے اس علاقے پر تین اداروں کے ذریعے حکومت کی۔ فوج، بیوروکریسی اور جاگیردار۔ فوج اور بیوروکریسی کے کمانڈر انگریز تھے اعلیٰ سول عمال بھی انگریز تھے ان سے نیچے بڑی تعداد میں ہندوستانی تھے۔ ذرا ڈھانچے پر دھیان دیجئے۔ معیشت میٹروپولیٹین معیشت کے ساتھ منسلک تھی ہم جو پیدا کرتے برطانیہ کو سپلائی کر دیتے ہم عام استعمال کی چیزیں یورپ یا صنعتی دنیا سے خریدتے۔

اب پاکستان پر نظر کیجئے۔ پچاس سال گزرنے کے بعد بھی یہی صورتحال ہے برطانیہ سے تربیت یافتہ فوج، برطانیہ کی تربیت یافتہ بیوروکریسی اور وہی جاگیردار جو برطانیہ سے تعاون کرتے رہے یہی تکون اب بھی موجود ہے۔ ہم اپنا بیشتر اسلحہ مغرب اور چین سے خریدتے ہیں اپنے ہاں بہت کم اسلحہ بناتے ہیں۔ ہماری بڑی مصنوعات صنعتی ملکوں سے آتی ہیں۔ ان کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ پہلے برطانیہ سے درآمدات ہوتی تھیں اب زیادہ تر امریکہ جاپان اور جرمنی سے ہوتی ہیں۔ گلوبلائزیشن کے سبب سے خریدنے اور بیچنے والوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوگیا ہے باقی کوئی اور چیز تبدیل نہیں ہوئی سیاسی حقیقت بھی تبدیل نہیں ہوئی

پھر نوآبادیات کے احیاء تجدید کی بات کیوں کریں۔ پاکستان نوآبادیاتی چنگل سے کبھی نکل ہی نہیں سکا۔ ہم پھر سے نوآبادیاتی قبضے میں جانے کی باتیں کیوں کرتے ہیں؟ پاکستان کبھی نوآبادیاتی نظام سے گلوخلاصی حاصل نہیں کرسکا گلوبلائزیشن کے تناظر میں یہ پھر سے نوآبادیت کی گرفت میں نہیں لایا جارہا۔ گلوبلائزیشن کا مفہوم بین الاقوامی اقتصادی ڈھانچے کو تبدیل کرنا ہے یہ ہماری معیشتوں کا ڈھانچہ تبدیل نہیں کرتا۔

س: ہندوستان میں ماحول محفوظ کرنے کی تحریک کے ایک سرگرم عمل کارکن وندنا شیوا نے مجھے بتایا کہ وہ ایک گاؤں میں گئیں اور گلوبلائزیشن اور کثیر القومی کارپوریشنوں کی توسیع کے بارے میں بتایا۔ دیہاتی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ اچانک بولا میں سمجھ گیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی جارہی ہے۔

ج: یہ اچھی بات ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو کمپنی بہادر کہا جاتا تھا؟

س: ایسٹ انڈیا کمپنی شاید کثیر القومی کارپوریشنوں میں سے پہلی کارپوریشن تھی؟

ج: ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی اور کئی اور کمپنیاں تھیں ایسٹ انڈیا کمپنی نے آخر ہندوستان جیت لیا۔ آج کثیر القومی کارپوریشنوں کی شدت اور اثر میں بہت اضافہ ہو چکا ہے۔ ذرائع مواصلات اور ذرائع پیداوار نے بڑی ترقی حاصل کرلی ہے، پیداوار میں تیزی اور پیداواری سلسلے کو جاری رکھنے کی صلاحیت کے سبب سے جہاں اشیاء کی پیداوار بڑھی ہے وہاں تاجروں اور اشیا بنانے والوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوگیا ہے لیکن سرمایہ دارانہ نظام کا ڈھانچہ نہیں بدلا، البتہ اس کی صلاحیت اور شدت بڑھ گئی ہے۔

اپنے اصل کی طرف واپسی

س: وہ کیا حالات تھے جن میں بی بی سی نے آپ کے بارے میں دستاویزی فلم بنائی تھی؟

ج: بی بی سی نے کہا تھا کہ وہ میری زندگی کے علاوہ نیشنلزم کے بارے میں ڈاکومنٹری بنانا چاہتے ہیں اس میں بشپ ڈیز منڈ ٹوٹو، ایرک ہابس بام، میکسن ہانگ کنگسٹن اور میں حصہ لوں گا۔ وہ افراد کی زندگیوں کے حوالے سے موجودہ دور کے احوال بیان کرنا چاہتے تھے میں نے اس منصوبے میں حصہ لینے پر آمادگی ظاہر کردی۔ فلم بنی اور اس کے بعض حصے دیکھنے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ہابس اور میرے بارے میں جو حصے ہیں انہیں مواد کے اضافے کے ساتھ الگ کردیا جائے۔ سو میرے بارے میں الگ ڈاکومنٹری تیار ہوگئی اس میں میری دلچسپی

MashalBooks.org

کا ایک سامان یہ ہوا کہ میں بہار میں اپنے اس گاؤں بھی گیا جسے تقسیم کے بعد سے میں دیکھ نہیں سکا تھا۔

س: کیا بی بی سی کے متبادل پی بی ایس نے یہ ڈاکومنٹری امریکہ میں دکھائی؟

ج: پی بی ایس نے ایڈورڈ سعید اور ان کے کام کے بارے میں بڑی عمدہ فلم "The Idea of Empire" کے نام سے فلمائی۔ (25) انہوں نے ہی میرے بارے میں بھی ڈاکومنٹری بنائی۔ بعض صورتوں میں یہ دونوں امریکی ڈاکومنٹریز ہیں۔ ہم دونوں امریکہ میں رہے ہیں اور کچھ نام کمایا ہے ایڈورڈ نے مجھ سے بھی زیادہ۔ ہم نے امریکی تاریخ میں کردار ادا کیا ہے۔ میں نے شہری حقوق کے سلسلے میں اور ایڈورڈ نے خاص طور پر علم کے ضمن میں۔ پی بی ایس اور کسی دوسرے نیٹ ورک نے انہیں دوبارہ دکھانے کا نہیں سوچا۔ بی پی ایس نے ان فلموں پر خاصے پیسے خرچ کئے ہیں۔ بی پی ایس، بی بی سی سے ماسٹر پیس تھیٹر کی طرح کی گئی فلمیں لیتا ہے لیکن سنجیدہ قسم کی دستاویزی فلمیں نہیں لیتا۔

س: فلم میں آپ نے گرینڈ ٹرنک روڈ پر سفر کیا۔ یہ شاہرہ اختیار کرنے کے پیچھے کیا محرک تھا؟

ج: سیدھی سی بات ہے میں نے اس کے نزدیک ہی زندگی گزاری ہے۔ یہ جرنیلی سڑک سولہویں صدی میں شہنشاہ شیر شاہ نے بنائی تھی یہ کلکتہ سے پشاور تک جاتی ہے میرے نزدیک یہ ہندوستان کے اتحاد کی علامت ہے، پھر ہندوستانی اور پاکستانی نیشنلزم نے اس شاہراہ کو توڑ دیا۔ 1947ء میں اس کا تسلسل ختم ہوگیا یہ عجیب بات ہے کہ آپ اچانک ایک خاص جگہ آتے ہیں جہاں گرینڈ ٹرنک روڈ ختم ہوجاتی ہے پھر آپ پاکستانی اور ہندوستانی چیک پوسٹوں میں سے گزر کر دوبارہ گرینڈ روڈ پکڑ لیتے ہیں۔

میرا اس شاہرہ سے بچپن سے اب تک مختلف صورتوں میں واسطہ رہا ہے۔ اس کے آس پاس رہا ہوں۔ اس کے آس پاس ہی بڑا ہوا ہوں۔ بچپن کے دنوں میں اس پر سفر کرتا رہا ہوں اور ڈیارڈ کپلنگ کو پڑھ کر اس سے رومانوی نسبت میں مبتلا رہا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ کپلنگ نوآبادیاتی دور کے ادیب تھے اور اچھے ادیب تھے انہوں نے اس شاہرہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ یہ شاہرہ برصغیر کے اتحاد اور تقسیم اور خوں ریز زندگی کی بطور علامت وضاحت کرے گی۔

آپ اپنے گاؤں ارکی واپس گئے جو آپ نے تیرہ برس کی عمر میں آخری بار دیکھا تھا۔ یہ

MashalBooks.org

ایک خوش کن منظر ہوگا۔ سارے بچے بالے آپ کے گرد جمع ہو گئے ہوں گے اور آپ ایک اہم شخصیت کے طور پر وہاں پہنچے ہوں گے۔ آپ نے کئی بھولی بسری باتیں پھر سے یاد کی ہوں گی۔ مثال کے طور پر آپ نے کہا ہے کہ آپ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رہتے دیکھا تھا اُن کی روایات کا نظارہ کیا تھا عید کی نماز کے بعد ہندو ہمسائے آتے اور مسلمانوں کو عید کی مبارک باد دیتے تھے۔

ج: عید مسلمانوں کی تقریب ہے جو رمضان کے آخر میں آتی ہے۔ رمضان کے آخری دن شام کی نماز ادا کرنے کے بعد عید کی خوشیوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے ہاں مٹھائی بھیجتے ہیں۔ میرے گاؤں میں دو مسجدیں تھیں عید کی نماز ایک مسجد میں ہوتی تھی مسجد کے باہر ہمارے ہندو دوست ہمیں عید کی مبارک دینے آ جمع ہوتے۔

ہم فلم بنانے گاؤں کی طرف جا رہے تھے تو سب سے پہلے مسجد نظر آئی۔ مسجد دیکھ کر ہی میں گاؤں کو پہچان سکا۔ مجھے اس بات نے بھی بے حد متاثر کیا کہ پچاس برس گزر جانے کے باوجود گاؤں کے ہندو اور مسلمان باسیوں نے میرے خاندان کو یاد رکھا اور اس کے بارے میں محبت اور احترام کا اظہار کیا۔ جیسے جیسے لوگوں کو خبر ہوتی گئی وہ مجھے دیکھنے آتے رہے۔ بڑی عمر کے لوگ خاص طور پر بہت جذباتی تھے۔ انہیں بہت سی باتیں یاد تھیں لوگوں کے بارے میں پوچھتے رہے۔ ہمارے یہاں سے جانے کے بعد سے یہ گاؤں زیادہ غریب دکھائی دیا۔ ہماری بڑی لائبریری تھی۔ میرے دادا نے پانچ ہزار کتابوں سے ایک لائبریری قائم کی تھی یہاں تین ہزار مخطوطے بھی تھے 1946ء اور 1947ء میں رات کے دوران یہ سب کچھ تباہ ہو گیا۔

س: ارکی بھی فرقہ وارانہ فسادات سے محفوظ نہ رہا؟

ج: ارکی میں کچھ فرقہ وارانہ تشدد ہوا اتنا نہیں، البتہ دوسری جگہوں پر زیادہ ہوا۔

س: فلم میں ایک بہت ہی تکلیف دہ منظر ہے جب آپ گاؤں کا قبرستان دیکھنے جاتے ہیں اور اس خاص واقعہ پر تبصرہ کرتے ہیں جس نے آپ کو خوشی بھی دی اور درد بھی۔

ج: میرے والد کی قبر غائب ہو گئی ہے۔ قبرستان میں بعض کسانوں نے قبرستان سے ہی لے کر اینٹوں اور پتھروں سے مکان بنا لئے ہیں۔ یہ تکلیف دہ منظر تھا لیکن یہ سوچ کر خوشی بھی ہوئی کہ مردوں نے زندوں کو سامان زیست فراہم کر دیا ہے۔ پتھروں کو قبروں میں استعمال

کرنے سے بہتر ہے کہ ان سے مکان بنالئے جائیں میرا خیال ہے کہ میرے مرحوم والد بھی ضرور خوش ہوئے ہوں گے۔

س: فلم کلکتہ سے شروع ہوئی ہے۔ آپ نے بچے کے طور پر یاد کیا ہے کہ 1940ء میں آپ خاندان کے ان افراد سے ملنے وہاں گئے تھے جو نیشنلسٹ تحریک میں حصہ لینے کے سبب سے قید کر دیئے گئے تھے۔ آپ رابندر ناتھ ٹیگور سے بھی ملے تھے۔

ج: ٹیگور پورے ہندوستان میں بے حد لائق احترام سمجھے جاتے تھے وہ انٹرنیشنلسٹ تھے انہوں نے نیشنلزم کے بارے میں سخت تنبیہہ کی تھی وہ اس وقت بہت بوڑھے ہوگئے تھے۔ بہت لوگ انہیں دیکھنے جاتے تھے۔ وہ ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے انہوں نے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے وہ بہت صاف بولتے تھے۔ انہوں نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور کچھ اس قسم کی بات کی ''اچھے لڑکے بنو'' بس مجھے صرف اتنا ہی یاد ہے۔ ان کی تحریریں میں نے حال ہی میں پڑھی ہیں۔ گذشتہ چھ سال کے دوران۔ میں حیران ہوں کہ وہ کتنے صحیح الفکر انسان تھے۔

س: فلم میں آپ نے یاد کیا ہے کہ 1946ء میں جب بہار میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے تو مہاتما گاندھی وہاں آئے تھے۔ انہوں نے ہندو اور مسلمان بچوں کو ساتھ لیا جن میں آپ بھی شامل تھے اور تباہ شدہ دیہات کا دورہ کیا جو اتحاد کی علامت تھا۔

ج: میں نے مہاتما گاندھی کے ساتھ چھ ہفتے سفر کیا۔

س: کیا آپ کا ان سے ذاتی رابطہ رہا۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا تاثر ہے؟

ج: میرا اُن سے روز رابطہ رہتا تھا۔ کاش میرا ذہن اس وقت صاف ہوتا۔ اتنا جتنا آج ہے۔ اس وقت بارہ سال کی عمر میں پاکستانی نیشنلزم کی گرفت میں تھا۔ گاندھی کو ایک غیر دوست سیاست دان سمجھتا تھا کیونکہ وہ کانگریس کے لیڈر تھے۔ میں اس لئے ان کے ساتھ گیا تھا کہ میرے والد اور والدہ کا کانگرس سے تعلق تھا۔ میں اپنے بھائیوں کے اثر میں تھا جو مسلم لیگ کے طرف دار ہو گئے تھے۔ میرا سیکھنے کا ارادہ نہیں تھا حالانکہ ہونا چاہیے تھا۔ بعض باتیں بڑی واضح تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ گاندھی کے گرد ایسے لوگ جمع تھے جو ان سے گہری محبت رکھتے تھے وہ ان کی باتیں سنتے اور ان کے کہنے پر عمل کرتے۔ یہ سب کچھ محبت کا اثر تھا۔ یہ نہیں کہ گاندھی کی شخصیت کرشماتی تھی اور جس سے خاص طاقت کا فشار ہوتا تھا۔

وہ ایک شریف شخص تھے۔ میں آپ کو ایک قصہ سناتا ہوں۔

میرے بھائیوں نے مجھ سے کہا کہ تم گاندھی کے ساتھ جارہے ہو ان سے کہنا کہ وہ تمہیں انگریزی سکھادیں۔ گاندھی بہت اچھی انگریزی لکھتے ہیں ان کی کتاب ''تلاش حق'' پڑھو۔ میں نے مہاتما گاندھی سے کہا کہ میرے بھائیوں نے کہا ہے کہ آپ نہایت اچھی انگریزی لکھتے ہیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میں ان لڑکوں کا شکرگزار ہوں۔ میں نے کہا کہ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اچھی انگریزی لکھنے کے اصول آپ سے سیکھ لوں۔ گاندھی جی بولے۔ میرے بیٹے صرف ایک اصول ہے بائبل بار بار پڑھو۔ وہ بھی کنگ جیمز کی بائیبل۔ انہوں نے کہا کہ میں ''کنگ جیمز'' کی بائیبل پڑھتا ہوں۔ چنانچہ میں ہمیشہ یہ بات یاد رکھتا ہوں، آپ گاندھی کی تحریریں پڑھیں تو آپ کو ان میں بائیبل کی انگریزی کی سادگی، چھوٹے فقرے سادہ بیانیہ اور گفتگو کا انداز نظر آئے گا۔

س: کیا گاندھی جانتے تھے کہ آپ کے والد اس لئے قتل کئے گئے کہ وہ کانگرس کے حامی تھے؟

ج: وہ ہمارے خاندان کی تاریخ سے واقف تھے۔

س: تب آپ نے ہندوستان چھوڑ کر بڑا تکلیف دہ فیصلہ کیا ہوگا۔

ج: نہیں۔ ہرگز نہیں۔

س: یہ آپ کے لئے تکلیف دہ نہ سہی، لیکن ماں کو پیچھے چھوڑ آنا یقیناً گراں گزار ہوگا۔

ج: میں اپنے فیصلے خود نہیں کرتا تھا فیصلے میرے لئے کئے جاتے تھے۔ میری عمر تیرہ سال تھی ہندوستان میں جب آپ کی عمر تیرہ برس کی ہو تو آپ اپنے فیصلے خود نہیں کرتے۔

س: آپ کے بھائیوں نے کہا کہ تم پاکستان چلو۔

ج: انہوں نے کہا چلو میں چل دیا۔

س: آپ کی والدہ نے اس بارے میں کیا کہا ہوگا؟

ج: وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ہم میں سے کوئی بھی جائے۔ ایک وقت انہوں نے غصے میں آکر کہا تم جانا چاہتے ہو تو جاؤ لیکن جان لو کہ تم سب ''مسلم صیہونی'' بن جاؤ گے۔ وہ سخت غصے میں تھیں۔

س: ان کا نام کیا تھا؟

ج: خاتون

س: اور آپ کے والد کا؟

ج: رحمٰن

س: آپ کے چلے آنے کے بعد آپ اپنی ماں سے کبھی مل سکے؟

ج: کبھی نہیں

س: انہوں نے کب وفات پائی؟

ج: انہوں نے 1972ء میں انتقال کیا۔ ان کے مرنے سے کچھ ہی دیر پہلے میں نے انہیں دیکھا تھا لیکن وہ اتنی بیمار تھیں کہ مجھ سے بات نہیں کر سکیں۔

س: جس قافلے کے ساتھ آپ ارکی سے نکلے وہ گرینڈ ٹرنک روڈ (جرنیلی سڑک) پر چلتا دہلی قلعے کے قریب پہنچا۔ آپ کو یہ سب باتیں اچھی طرح یاد ہیں!

ج: آپ نے فلم میں یہ دیکھا ہے اس کے بارے میں بات کرنا بہت مشکل ہے۔

س: جذبات کی وجہ سے؟

ج: یہ بہت مشکل ہے۔ فلم بناتے وقت بھی یہ مشکل تھا۔ میں نے ان باتوں کے بارے میں کبھی نہیں لکھا فلم بنانا نسبتاً آسان تجربہ تھا کیونکہ پوری ٹیم تھی، ٹیکنالوجی تھی، کیمرے تھے، ایک طرح سے آپ ایک کردار ادا کر رہے تھے۔

س: آپ کو نہرو کا قلعے میں آنا یاد ہے؟

ج: وہ دوبار آئے۔ انہوں نے مہاجروں سے پوچھا کہ ان کا حال کیا ہے اور انہیں کیا چاہیے۔ انہوں نے شکائتیں سنیں کہ رات کو انہیں سخت سردی لگتی ہے۔ چند گھنٹوں کے بعد کمبل آ گئے انہیں دھیان رہا اس بات کا۔

مارکس کا ورثہ

س: چلئے آگے بڑھتے ہیں 1995ء میں کمیونسٹ مینی فیسٹو کی 150 ویں سالگرہ ہے اس کے بارے میں کئی سمپوزیم اور کانفرنسیں ہو رہی ہیں۔ کارل مارکس کے تعلق سے اور ان کی میراث کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

ج: مارکس کے بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے غریبوں اور مزدور طبقے کی جانب ہماری توجہ دلائی۔ دوسرے مارکس اور فریڈرک اینگلز نے سرمایہ داری کی ترقی اور سرمایہ دارانہ نظام کے استحصالی اور جابرانہ طریقوں کی وضاحت کی۔ سرمایہ داری کو تو شکست نہ دی

MashalBooks.org

جا سکی اور نہ تبدیل ہوئی بلکہ بڑی حد تک اس نے لچک اور فطری قوت وحرکت کا مظاہرہ کیا یہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔لیکن اس سے اس حقیقت کا بطلان نہیں ہوتا کہ سرمایہ داری ایک غیر منصفانہ نظام ہے۔ہمیں ابھی یہ دریافت کرنا ہے کہ اس سے کیسے نجات پائی جاسکتی ہے یا کم ازکم اس کے بُرے پہلوؤں کو کیسے ختم کیا جاسکتا ہے۔ یہ چیلنج آج بھی موجود ہے اور یہ چیلنج مارکس نے دیا تھا۔

مارکس اور مارکسزم کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس نے ہمیں معاشرتی اور تاریخی حقائق کا تجزیہ کرنے کا طریقہ بتادیا۔ میرے خیال میں ابھی تک تاریخی مادیت کا ایسا متبادل تلاش نہیں کیا جاسکا جو تاریخ کی تبدیلی اور تاریخ کے طریقوں کی وضاحت کر سکے۔ نہ ہی کسی نے جدلیات کے تصور کی اس طرح اصولی طریقے سے صراحت کی ہے جس طرح مارکس اور مارکسزم نے کی ہے۔ یہ کوئی معمولی کامیابیاں نہیں یہ بہت اعلیٰ پائے کی کامیابیاں ہیں۔اور اس مقصد سے حاصل کی گئی تھیں کہ تعلیم یافتہ طبقے اور یا اس کے ایک خاص حصے کی توجہ عوام، غریب، مزدور دبے ہوئے کمزور اور دور افتادہ لوگوں کی طرف دلائی جائے۔اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

انسانی تاریخ، دوسروں کو مسترد کرنے کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ یہ دوسروں کے بارے میں سنگدلی اور بے رحمی کے رویوں کا مرقع ہے وہ ایسی عادات اور روایات اور ایسے دانشمندانہ نقطۂ نظر کے خلاف ہے جو آپ کے نہیں ہیں۔ مارکس اور مارکسزم نے دانشوروں کی توجہ دوسروں کی طرف جو غریب اور کمزور ہیں مثبت انداز میں دلائی ہے۔کم ازکم اہل دانش کے ایک حصے نے بحیثیت مجموعی ان کے علاوہ طلبہ اور دوسروں نے حقیقت کو سمجھنے کے ضمن میں اپنی اخلاقی اور فکری ذمہ داری کا احساس کیا تاکہ اسے بدلا جاسکے اور دنیا کو اپنے لئے ہی نہیں بلکہ سب کے لئے بہتر زندگی بسر کرنے کی جگہ بنایا جاسکے۔میرا خیال نہیں کہ تاریخ میں اس سے پہلے یہ انداز فکر اپنایا گیا ہو۔ایک بار یہ کلچر پیدا کرلیا گیا تو پھر یکسر مختلف قسم کا لٹریچر لکھا اور مختلف قسم کی فلمیں بنائی جانے لگیں۔ دی سیکا، سیتہ جیت رائے اور گودار دا ایسے اصحاب فکر و دانش کی بنائی ہوئی فلمیں دیکھنے کو ملنے لگیں۔ یہ 1930ء اور 1940ء سے 1950ء تک کے عرصے سامنے آنے والی فنکارانہ تخلیقات ہیں جن کا محرک یہ خیال ہے کہ دوسروں کے بارے میں مثبت اور ہمدردانہ رویے اور طریقے اپنانے چاہیں۔

MashalBooks.org

اس نے زندگی کے بارے میں ایسا ہمدردانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی تحریک کی جس میں خود پرستی کا کوئی گزر نہیں تھا۔ مارکس سے پہلے کسی حد تک یہ رویہ موجود تھا اور وہ کسی مذہبی شخصیت سے منسوب کیا جاتا تھا لیکن اب یہ پہلا موقعہ تھا کہ مشترکہ بہتری کے مسائل کو سیکولر انداز سے دیکھا اور سمجھا جانے لگا۔

س: ایشیا میں معاشی انحطاط کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ جولائی 1997ء سے تھائی لینڈ، ملائیشیاء، انڈونیشیا، جنوبی امریکہ اور جاپان نے شدید اقتصادی زوال دیکھا ہے۔

ج: مجھے تسلیم ہے کہ میں نے ایشیا کے اقتصادی بحران کا احتیاط کے ساتھ جائزہ نہیں لیا میرے خیال میں ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ داخلی بحران سرمایہ داری نظام کا حصہ ہے، یہ بڑی تیزی سے بڑھتا اور پھیلتا ہے یہ عمل مہنگا بھی بہت ہے۔ یہ ایک ایسی مصروف اور تیز سڑک کی طرح ہے، جس پر اکثر بڑے حادثے ہوتے رہتے ہیں اور ٹریفک میں خم پیدا ہوتا رہتا ہے۔ یہ 1997ء کی دہائی میں امریکہ میں ہوا۔ اس کے بعد سے یہ ہوتا آیا ہے، لیکن اس حد تک کہ اس پر قدرے آسانی سے قابو پایا جاتا رہا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ایشیائی ملکوں کی معیشت کمزور ہے۔ ان میں دو چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ کوریا بجلی کا سامان اور موٹر کاریں بناتا ہے، ملائشیا بنیادی طور پر برآمدات کے لئے پلیٹ فارم کا درجہ رکھتا ہے۔ اس لئے تادیر بحران برداشت نہ کر سکا اس صورت حال میں ایشیائی ملکوں کی معیشت انتہائی درجہ حساس ہے۔ دوسرے جاپان ایک بار بحران کا شکار ہوا جو سرمایہ داری کی اصطلاح میں سردیوں کا زکام کہلاتا ہے۔ بعض ملکوں کو یہ زکام لگتا ہے تو بگڑ کر نمونیا بن جاتا ہے اس لئے کہ ان میں قوت مزاحمت نہیں ہوتی ان پر اتنا ہی دباؤ ہوتا ہے خاص طور پر ان کی کرنسی پر اتنا دباؤ ہوتا ہے جسے وہ برداشت نہیں کر سکتے۔

ملائشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد نے ایشیائی کرنسیوں کے نرخ گرنے پر سخت غصے اور بوکھلاہٹ کا اظہار کیا اور ہنگری نژاد سرمایہ کار جارج سوروس کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اسے مجرم قرار دیا۔ میں نہیں جانتا کہ سوروس کا اس میں کتنا عمل دخل تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ٹائیگر کہلانے والے ان ملکوں کے وزرائے اعظم اور لیڈر یہ سمجھتے ہیں کہ کرنسی کا کاروبار کرنے والا ایک شخص ان کی معیشتوں کو اس درجہ نیچے تک گرا سکتا ہے۔ یہ اس امر کا اظہار ہے کہ اِن ملکوں کی معیشت بے حد کمزور ہے۔

یہ اس امر کا بھی مظہر ہے کہ عالمی ماہرین معیشت اور عالمی بینک اور انٹرنیشنل مانٹری فنڈ (عالمی مالیاتی فنڈ) ایسے ادارے مشرقی ایشیا کی معیشتوں کی کامیابیوں کے بارے میں مبالغہ آرائی کرتے رہے۔ انہیں حقائق سے آگاہ ہونا اور دیکھ لینا چاہیے تھا کہ یہ شیر اپنی دو ٹانگوں پر کھڑے ہیں۔ محض جسم پر دھاریاں کسی کو شیر نہیں بنا سکتیں۔ لیکن وہ یہ دیکھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ یہ دردناک امر ہے۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرمایہ داری کو فروغ دینے کی خواہش اتنی مضبوط ہے کہ وہ اس کی تمام تر برائیوں کو خوش رنگ پیکٹوں میں بند کرتے اور گاہکوں کو اس سے بے خبر رکھتے ہیں کہ ان میں کیا ہے۔ کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے کہ یہ برا سودا ہے۔

س: سرمایہ داری سے منسوب اس لچک کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو اسے اقتصادی نظام کے طور پر زندہ رکھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور رکھتی ہے۔

ج: یہ ایک طاقتور نظام، جو دو اہم بنیادوں پر استوار ہے۔ ایک یہ کہ انسان لالچی ہوتا ہے لالچ انسان کو متحرک رکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔ لالچ ہر چیز کے لئے دولت، اقتدار، اور جمع جتھہ۔ دوسرے یہ کہ استعمال کے لئے اشیاء دوبارہ پیدا کرنا ممکن ہے۔ اس لئے پیداوار انسانی جدوجہد کا اہم ترین محرک اور خلاصہ ہے۔ یہ بڑا زوردار نظام ہے غیر معمولی انسان ہی اس کی گرفت سے باہر اور آزاد رہ سکتے ہیں۔

س: آپ برسوں سے سرمایہ داری کو چلتے دیکھ رہے ہیں۔ کیا اس دوران آپ کے تناظر میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟

ج: سرمایہ داری کے بارے میں میرے تناظر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کمیونزم کے بارے میں میرا تناظر بدل گیا ہے۔ گذشتہ پچیس یا تیس برس سے اس میں آہستہ آہستہ اور تدریجاً لیکن یقینی طور پر تبدیلی آئی ہے۔ 1972ء یا 1973ء تک مجھے یقین تھا اور میں شیخی نہیں بگھار رہا کیونکہ میری تحریروں میں بھی یہ موجود ہے کہ ناکامی سوویت سسٹم کا مقدر بن گئی تھی۔ اس کی دو وجوہ ہیں سوویت لیڈر بعض بنیادی اقتصادی اصولوں کو نظر انداز اور جمہوری طریق حکومت سے مکمل طور پر انحراف کر رہے تھے۔ جدید سوسائٹی کو چلانے کے لئے جمہوری طرزِ حکومت بنیادی درجہ رکھتی ہے اس کے بغیر وہ نہیں چل سکتی۔ 1970ء کے اوائل تک سوویت یونین کی ان دونوں باتوں میں ناکامی مجھ پر واضح ہو چکی تھی۔

میں انہیں سٹالنسٹ ناکامی نہیں سمجھتا۔ اس مسئلے پر میں قدرے مشکل محسوس کرتا آیا ہوں۔ میرے خیال میں اس ناکامی کا جزوی طور پر مارکس اور اینگلز سے تعلق ہے۔ مارکس نے ہمیشہ یہ کہا کہ وہ سائنس دان ہے پیغمبر نہیں۔ مستقبل کی سوسائٹی کا وجود نہیں تھا اس لئے وہ اس کی حدود متعین نہیں کر سکتا تھا۔ سماجی و معاشی سائنس دان کی حیثیت سے وہ جس چیز کو دیکھ سکتا تھا اس کا تجزیہ کر سکتا تھا اس کا موقف صحیح تھا اسے غلط نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ جب آپ تبدیلی لانے کے عمل میں مصروف ہوں تو پھر آپ کو مستقبل کے بارے میں پیش بینی کرنے کا خطرہ مول لینا چاہیے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ سائنسی طریق نہیں۔ لیکن ہمیں مستقبل کے بارے میں پیش بینی کرنے کے لئے فنکارانہ اور سیاسی طریق اختیار کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر مارکس نے Eighteenth Brumaire میں اپنے ایک مختصر سے بیان میں یہ کہنے سے گریز کیا کہ کمیونزم کیا شکل اختیار کرے گا۔ (27) مارکس اینگلز اور ان کی پود کو کسی قدر ناکامی ہوئی۔ میرے خیال میں سب سے بڑی ناکامی لینن کی تھی اس پر بحث کرنے کے لئے گھنٹوں درکار ہوں گے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ لینن کے خیال کا ڈھانچہ، مارکس اور اینگلز کے برعکس جمہوریت مخالف ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے لینن نے پرولتاری آمریت کا جو تصور پیش کیا وہ جمہوری مرکزیت کا حامل اور جمہوریت کا مخالف تھا۔ جمہوری مرکزیت جمہوری دکھائی دیتی ہے اس لئے اس امر کا سوویت یونین پر انحصار تھا کہ بالشویک انقلاب برپا ہونے کے بعد وہ سوویٹس کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ انہوں نے کیا یہ کہ اوپر سے کنٹرول نافذ کرایا اور اس کی خودمختاری تباہ کر دی اس طرح جمہوری مرکزیت جمہوریت سے زیادہ مرکزیت ثابت ہوئی۔ دراصل 1919ء اور 1920ء میں اور لینن کی زندگی میں جس پر عمل ہوا وہ مرکزی جمہوریت تھی مرکزیت پہلے آئی تھی اور جمہوریت بعد میں اس کے بعد۔ اس کے جواز میں آپ چاہیں تو ہزاروں عذر اور توجیہات پیش کر سکتے ہیں کہ سفید انقلاب آ گیا، خانہ جنگی آئی سوویت انقلاب پر حملہ ہوا اور وہ الگ تھلگ رہ گیا اور اس کے بعد قحط پڑ گیا۔ لیکن اس سب کے باوجود ناکامی کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ اس کا جواز تو پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ناکامی ہی رہے گی یہ سب نظری اور فکری باتیں ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی جیسے امریکی انتظامیہ کہے کہ دہشت گردی ہے اس لئے آپ شہری آزادیوں سے دستبردار ہو جائیں۔ یہ سب اقتدار اور طاقت کے بہانے ہیں۔ لینن کا طبعی

رجحان تھا کہ وہ مخالفت برداشت نہیں کرتا تھا۔ ...... نکولائی بخارن پہلے ہی مشکل میں تھا۔ سٹالن نے ان رجحانات کو جو لینن کے دور میں قابلِ شناخت تھے معقول حدود سے باہر تک بڑھا دیا۔ لینن اسے دیکھتا تو اسے صدمہ ہوتا لیکن یہ رجحان اسی کے دور میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اطالوی کمیونسٹ انتونیو گرامچی تک کوئی سنجیدہ مارکسی خیال بحث کا موضوع نہیں بنا۔ میرے خیال میں ہماری مشکل یہ ہے کہ انتونیو گرامچی کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ اور وہ اس درجہ خشک اور دھیما تھا کہ پوری دنیا میں اس کا سمجھا جانا ممکن نہیں تھا۔ گرامچی کے بعد ہماری سوشلسٹ اور مارکسی تحریکیں قومی آزادی کی جنگوں سے متعلق حکمت عملی وضع کرنے تک ہی محدود ہیں۔ ہم ان جنگوں کو جیتنے اور موثر بنانے میں اُلجھے رہے لیکن ہم انہیں آگے بڑھانے میں کچھ اچھا کردار ادا نہیں کر سکے، بہر حال چینی اپنے آپ کو زندہ رکھنے میں کامیاب رہے، لیکن اس کے لئے انہیں بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ مجھے اُمید ہے کہ مارکس کی سالگرہ پر ہم اپنی ناکامیوں کا سختی اور دیانت داری سے جائزہ لیں گے۔ سب سے اہم بات تخلیقی جوہر کو بروئے کار لانے کی ہے۔ میرے خیال میں لیفٹ کی کامیابیاں بڑی ہیں۔ کلچر کے مسئلے میں اور بھی زیادہ بڑی ہیں۔ لیفٹ نے سوسائٹیوں سے زیادہ لٹریچر آرٹ اور سینما میں زیادہ تبدیلیاں اور اضافے کئے ہیں۔ لیننسٹ لیفٹ نے طویل عرصے تک اور غیر منصفانہ طور پر یورپ کے سوشل ڈیموکریٹس کو نہ صرف ہدف تنقید بنائے رکھا بلکہ انہیں غیر مارکسی کہہ کر ان کی مذمت کی اور انہیں مسترد کر دیا۔ یہ کوئی منصفانہ بات نہیں میں یہ کہنے کی کوشش نہیں کر رہا کہ وہ بہترین مارکسی ہیں یا خالص مارکسی ہیں لیکن وہ اس سوشلسٹ روایت کا حصہ ہیں جو مارکسی تحریک کے سوشل ڈیموکریٹک حصے سے مختص رہی ہے۔ انہوں نے محنت کش عوام کی بہتری اور بہبود کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ یہ کوئی چھوٹی کامیابی نہیں۔

س: روس میں کل آج کیا ہو رہا ہے آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: روس سرمایہ دار سوسائٹی بننے کے لئے بہت زور لگا رہا ہے۔ سوشلزم کے خاتمے کے ساتھ ہی انہوں نے لالچ کا کلچر اپنانے کی تگ و دو شروع کر دی ہے۔ لیکن جو دو شرائط اس کی کامیابی کی ضامن ہیں وہ روس نے پوری نہیں کیں۔ ان میں سے ایک مینجمنٹ اور تنظیمی ڈسپلن ہے اور دوسری پیداواری صلاحیتیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ روس زیادہ سے زیادہ دوسرے درجے کا تیسری دنیا کا ملک دکھائی دیتا ہے۔ کئی اعتبار سے وہ پاکستان سے بھی بڑا ہے۔ ہم کم سے

MashalBooks.org

کم اتنا تو جانتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کا کس طرح انتظام کر سکتے ہیں، روسیوں کی سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی۔ سرمایہ دارانہ نظام کی تندی وتیزی کے تین اجزاء ہیں لالچ پیداوار، اور مینجمنٹ۔ روسیوں میں لالچ تو آ گیا ہے لیکن انہوں نے دوسرے دو اجزا پیداوار اور انتظام کو ابھی اہمیت نہیں دی۔

علمی وفکری کام

س: آپ کی کوششوں میں خلدونیہ یونیورسٹی قائم کرنا بھی شامل ہے، اس کے سلسلے میں کیا پیش رفت ہو رہی ہے؟

ج: کوئی نمایاں نہیں۔ پہلے سال 1992ء سے 1993ء تک تو آغاز بہت اچھا تھا۔ درمیانے طبقے حکومت اور صنعت کاروں نے مثبت رویہ اپنایا۔ میں یونیورسٹی شروع کرنے ہی والا تھا کہ نواز شریف کی پہلی حکومت معزول ہو گئی۔ 1993ء میں بے نظیر بھٹو اقتدار میں آئیں لگتا ہے کہ وہ میرے خلاف مخاصمت لے کر آئیں۔ ان کے والد کی بحیثیت وزیراعظم جو کارکردگی تھی میں نے اس پر سخت تنقید کی تھی۔ میں ضیاءالحق کی حکومت کا بھی سخت مخالف تھا اس اختلاف کی بناء پر خطرے بھی مول لئے۔ لیکن حکومت کی مخالفت کرتے ہوئے میں نے اکثر یہ بھی لکھا کہ ہم پر جو عذاب نازل ہوا ہے وہ ذوالفقار علی بھٹو کی غلطیوں کے باعث ہوا ہے۔ یہ باتیں بے نظیر بھٹو کو ناگوار گزری ہوں گی۔ لیکن یہ کوئی اصل مسئلہ نہیں اصل مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے تو ضیاءالحق کے کئی حامیوں کو جن میں ان کے قریبی دوست اور حلیف تھے اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ بے نظیر بھٹو اب اقتدار میں تھیں وہ چاہتی تھیں کہ میں ان کے دربار میں حاضر ہوں اور ان کا قرب حاصل کروں۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا درباری بننا میرا مزاج ہی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے مجھے نکال باہر کیا۔ یونیورسٹی کے لئے زمین حاصل کرنے کے لئے جو معاہدہ کیا جانا تھا وہ نہیں ہوا۔ اخباروں میں جب کبھی اس مسئلے پر اداریے لکھے گئے اور لوگوں نے احتجاج کیا تو انہوں نے وعدے کر لئے۔ دو تین مرتبہ ان کی حکومت کے کنٹرول والے ٹیلی ویژن نے اعلان بھی کیا کہ یونیورسٹی کے لئے سب کچھ ہو گیا ہے اور یہ جلدی کھل جائے گی۔ لیکن اصل میں کچھ بھی نہیں کیا جا رہا تھا۔ ان کے ساڑھے تین سال کے دور حکومت کے ساتھ ہی یہ معاملہ بھی ختم ہو گیا۔ انہوں نے میری حوصلہ شکنی کی میں نے

ان کے فیصلے کے انتظار میں اپنی بہت سی ساکھ کھودی۔ وہ چلی گئیں اور نواز شریف آ گئے۔ میں امریکہ میں سمسٹر پڑھانے کے بعد پاکستان واپس آیا تو میں نے یونیورسٹی کے لئے نئے سرے سے کوششیں شروع کیں۔ کچھ پیش رفت ہو رہی تھی لیکن پہلے جتنی رفتار سے نہیں کہ اسی دوران گذشتہ مئی میں ہندوستان نے ایٹمی دھماکے کر دیئے۔ دو ہفتے بعد پاکستان نے بھی دھماکہ کر دیا۔ ان ایٹمی دھماکوں کے سبب سے نئی پابندیاں لگ گئیں اور پاکستانی معیشت بُری طرح متاثر ہوئی۔ مجھے لگتا ہے کہ شدید مشکلات پیش آئیں گی ملک کو اس عرصے میں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایسے میں ایک نئی پرائیویٹ یونیورسٹی کے قیام کے لئے مطلوبہ سرمائے کی فراہمی اور حمایت کا حصول مشکل ہے۔ میں اپنی کوششیں جاری رکھوں گا میں ہار نہیں مانوں گا اور منصوبہ ترک نہیں کروں گا۔

س: کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ امریکہ میں طویل عرصہ رہنے اور کام کرنے کے بعد آپ اب وہاں قیام پذیر ہیں تو کیا اس ملک (امریکہ) کے بارے میں آپ کا تناظر بدلنے لگا ہے۔

ج: نہیں ایسا نہیں۔ میں ہر سال دو تین مہینے امریکہ میں رہتا ہوں۔ ملک تبدیل ہو رہا ہے میرا تناظر اتنا تبدیل نہیں ہو رہا۔ اور اس ملک نے نیوڈیل، شہری حقوق کی تحریک اور امن کی تحریک سے جو فوائد حاصل کئے تھے وہ زیادہ تر کھو دیئے ہیں۔ یہ بہت بڑے فوائد تھے جو امریکہ کو نہیں کھونے چاہئیں۔

س: آپ کے خیال میں اس کا کیا سبب ہے؟

ج: ایک سبب ریگن اور جارج بش کے اقتدار کا طویل دور ہے۔ لیکن اس دور میں تھوڑی بہت تبدیلی ضرور آئی ان کے بعد صدارت کے عہدے پر بل کلنٹن جیسا کم نظر اور ناقابل اعتماد شخص متمکن ہو گیا۔ پھر یہ بڑا آرام دہ ملک ہے۔ جس ملک میں اتنا بہت سارا آرام میسر ہو اور جہاں خاص طور سے انقلابیوں اور سابق انقلابیوں کے لئے آرام و سہولتیں ہوں تو عمر کے ساتھ مزاج میں نرمی آ ہی جاتی ہے۔ چند افراد ہی ایسے ہوتے ہیں جو تبدیل نہیں ہوتے جیسے نوم چومسکی یا ہاورڈ زن۔ لیکن آپ ہر کسی سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ اتنا سخت ہو۔

س: کیا آپ بھی اتنے ہی سخت ہیں؟

ج: میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اس کا فیصلہ دوسروں کے کرنے کا ہے۔

س: بی بی سی کی ڈاکومنٹری میں فیض احمد فیض کی ایک بڑی حیرت انگیز نظم ''صبح آزادی'' ہے فیض

آپ کے پسندیدہ اردو شاعر ہیں۔ آپ نے ان کی یہ نظم ڈاکومنٹری میں کیوں شامل کی؟

ج: میں فیض کے سوا تیسری دنیا کے کسی ایسے شاعر کو نہیں جانتا جس نے نو آبادیاتی دور کے بعد نو آبادیت سے نجات پانے والے ملکوں کی مایوسی کا اس قادر الکلامی کے ساتھ اظہار کیا ہو۔ انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کے آزاد ہونے کے صرف چھ ماہ بعد یہ نظم لکھی تھی۔ وہ دراصل دونوں ملکوں سے مخاطب تھے۔ انہوں نے بڑے شفاف انداز میں اور غیر معمولی صفائی کے ساتھ اس ناقص عمل کا مشاہدہ کیا تھا جسے ہم آزادی کہتے تھے۔ اسی سبب سے یہ بڑی زور دار اور پُر اثر نظم تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ آغا شوکت علی نے کیا ہے۔ نظم ہے۔

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر۔(28)

س: علامہ اقبالؒ کا بھی تو ایک مشہور شعر ہے۔

ج: جی ہاں یہ شعر ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا (29)

حوالے

1۔ مولی مور Indian Riot Destroys Mosque واشنگٹن پوسٹ 7 دسمبر 1992ء

2۔ فلم The Idea of Empire ڈائریکٹر فرانسس ہنسیلے اور ٹم مے۔ تحریر ایڈورڈ سعید 1992ء اور Stories my country told me اقبال احمد کے ساتھ جرنیلی سڑک پر سفر۔ بی بی سی 1996ء

3۔ دیکھئے بین مورس کی کتاب The Birth of the Palestinian Refugee Problem 1994-1999۔ اور ایلان پپی کی کتاب The Making of Arab Israeli Conflict اور سمبا فلیپن کی کتاب The Birth of Israel

4۔ دیکھئے ایڈورڈ سعید کا مضمون The One-state Solution نیویارک ٹائمز میگزین 10 جنوری 1999ء

5۔ دیکھئے اقبال احمد کے مضامین 28 مارچ 1979ء۔ 15 اپریل 1979ء۔ 25 اپریل 1979ء اور 23 مئی 1979ء کے نیویارک ٹائمز ہیں۔

6۔ 21 اگست 1998ء کو نیویارک ٹائمز کا اداریہ Striking Against Terrorism

7۔ دیکھئے اقبال احمد کا مضمون Terrorism Theirs and Ours 12 اکتوبر 1998ء یہ مضمون آلٹرنیٹیو ریڈیو سے نشر ہو۔

8۔ رابرٹ فسک The Saudi Connection 9 اگست 1998ء اخبار انڈی پینڈنٹ۔

9۔ پریم شنکر جھا What's Behind the India-Pakistan Arms Race انٹرنیشنل ٹریبون 30 مئی 1998ء

10۔ جان ایف برنز Pakistan Answering India نیویارک ٹائمز 29 مئی 1998ء

11۔ اکبر احمد Jinnah, Pakistan and Islamic Identity

12۔ اقبال احمد کے مضامین Unilateral Muscle-Flexing in Unipolar World اور 23 اگست 1998ء ڈان Missile Diplomacy دی نیشن 21 ستمبر 1998ء

13۔ دیکھئے جیمز رزن کا مضمون To Bomb Sudan Plant or Not نیویارک ٹائمز 27 اکتوبر 1999ء

14۔ اقبال احمد Comprehending Terror مڈل ایسٹ رپورٹ مئی جون 1986ء

MashalBooks.org

15۔ جان کفنر Hijacking of Flight 847 نیویارک ٹائمز 17 جون 1985ء

16۔ ٹامس ایل فریڈ مین Angry, Wired and Deadly نیویارک ٹائمز 22 اگست 1998ء

17۔ ڈیوڈ اینڈرسن کا اقتباس جس کا حوالہ فلپ شینن نے اپنے مضمون Hitting Home میں دیا نیویارک ٹائمز 23 اگست 1998ء

18۔ ٹم وینر Iran said to Test Missile to Hit Israel and Saudis نیویارک ٹائمز 23 جولائی 1998ء

19۔ دیکھیے فرانز فینن کا اردو ترجمہ ''افتادگانِ خاک''

20۔ نائی پال کے ناول A House for Mr. Biswas/A Bend in the River

21۔ نائی پال Among the Believers

22۔ نائی پال Beyond Belief

23۔ اقبال احمد Feudal Culture and Violence ڈان

24۔ ڈبلیو بی ییٹس کی نظم The Great Day

25۔ حوالہ نمبر 2 دیکھیے

26۔ مہاتما گاندھی کی آپ بیتی

27۔ کارل مارکس The Eighteenth Brumaire of Bonaparte

28۔ فیض احمد فیض کی نظم ''صبح آزادی''

29۔ کلیات اقبال

MashalBooks.org

باب سوئم

پناہ گاہ قبول نہ کرو

جبر واستبداد اور شناخت

س: کہا جاتا ہے کہ یہودی تاریخی لحاظ سے کوئی ایک ہزار برس سے زیر عتاب رہے ہیں، ان کا صرف ایک وطن ہے اسرائیل، اور دوسری طرف بیس عرب ملک ہیں۔ فلسطینی ان میں سے کسی ایک میں بھی جا سکتے ہیں وہ عربی بولتے ہیں اس لئے ثقافتی لحاظ سے وہ اجنبیت محسوس نہیں کریں گے۔ آپ کا اس ضمن میں کیا خیال ہے؟

ج: یہ دلیل محض حجت کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہودیوں نے پورے یورپ میں بڑا عذاب سہا ہے۔ حال تک وہ امریکہ تک میں تعصّبات کا شکار رہے ہیں۔ یہ بھی تاریخی طور پر ثابت ہے اور یہودی عالموں نے اسے تسلیم کیا ہے کہ یہودیوں کی سب سے بہتر گزر اوقات اسلامی ملکوں میں ہوئی۔ چنانچہ انیسویں صدی تک ہم ''یہود عرب تہذیب'' کہتے رہے۔ بالکل جس طرح بیسویں صدی کے اواخر میں ''یہودعیسائی تہذیب'' کا ذکر ہوتا رہا ہے۔ یورپ کی صیہونیت دشمنی دوسری جنگ عالمگیر کے دوران اپنے عروج تک پہنچی۔ اگر یہودیوں کے زیر عتاب رہنے کی بنا پر ان کے لئے الگ اور مخصوص علاقے میں یہودی ریاست قائم کرنا مقصود تھی، تو یہ ریاست عرب دنیا میں نہیں بلکہ یورپ اور امریکہ میں قائم کی جانی چاہیے تھی۔ عربوں نے یہودیوں پر کوئی ظلم نہیں ڈھایا اس لئے ان پر کوئی الزام نہیں آتا۔ یہودیوں پر جہاں ظلم ہوا کفارہ بھی وہیں ادا کیا جانا چاہیے۔ میرے خیال میں اس نوع کے مسائل کا حل کفارہ ادا کرنے میں نہیں، لیکن اگر یہ ضروری

سمجھ لیا جائے تو اتحادیوں کو فیصلہ کرنا چاہیے تھا کہ یہودی ریاست جرمنی کے ایک حصے میں قائم کی جائے گی یا پولینڈ یا امریکہ کے حصے کے طور پر آباد کی جائے گی۔ فلسطینیوں کو ان کے گھروں اور علاقے سے کیوں نکالا جاتا جو وہاں دو ہزار سال سے رہتے چلے آ رہے تھے؟ انہوں نے وہاں کھیتی باڑی کی تھی شہر بسائے تھے یورپ کے احساس گناہ کی یاداش میں انہیں کیوں بے گھر اور بے وطن کیا جائے؟ اس کا ایک ہی جواب ہے جسے کج بحثی کہہ سکتے ہیں۔ میرا اصل جواب یہ ہے کہ ہمارے دور کے مسائل ملک یا قومیت نہیں۔ کالے لوگ طویل عرصے سے امریکہ میں عذاب وعقوبت کا شکار رہے ہیں۔ انہیں غلام بنا کر یہاں لایا گیا تھا انہیں پابند سلاسل رکھا گیا اور ان سے جبری مشقت لی جاتی رہی ان کی ساتھ نسلی سلوک روا رکھا جاتا رہا۔ اب کیا جنوبی امریکہ میں ان کے لئے الگ ریاست قائم کرنے سے ان کا مسئلہ حل ہو جائے گا؟ کیا البامہ اور مسی سپی کی ریاستوں کو کالوں کی ریاست بنا دیا جائے؟ نہیں، جواب یہ ہے کہ نسلی امتیاز ختم کیا جائے، تعصّبات پر قابا پایا جائے دونوں لوگوں کے درمیان ربط واتحاد اور کثیر القومی تشخص قائم کئے جائیں۔ بدی کا جواب بدی کو ختم کرنا ہے یہ نہیں کہ اسے الگ ریاست دے دی جائے۔

آپ ایک اسرائیلی ریاست قائم کرتے ہیں اس سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ ایک ایسی ریاست جس میں کوئی خوددار امریکی یا یورپی یہودی رہنا پسند نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ اگر امریکہ میں وہی قوانین ہوں جو اسرائیل میں ہیں تو کوئی خوددار یہودی یہاں رہنا گوارا نہیں کرے گا، کیونکہ یہودیوں سے امتیازی سلوک کیا جائے گا جس طرح عیسائی جائیداد خرید سکتے ہیں یہودی نہیں خرید سکیں گے، وہ فوج میں بھرتی نہیں ہوسکیں گے، وہ سول سروس میں شامل نہیں ہوسکیں گے۔ اسرائیل میں شہریوں کے دو درجے ہیں۔ ایک یہودی ہیں دوسرے عرب ہیں۔ عرب تیسرے درجے کے شہری ہیں۔ انہیں وہ شہری حقوق حاصل نہیں جو یہودیوں کو حاصل ہیں۔ کیا یہودی یہاںؔ (امریکہ میں) اس طرح کی ریاست چاہیں گے؟ جواب ظاہر ہے نفی میں ہوگا میں نہیں چاہوں گا، کہ کوئی یہودی یا مسلم ایک ایسے امریکہ میں رہے جہاں اس سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہو۔ مسئلے کا حل کثیر القومی اور کثیر الثقافتی معاشرہ اور مساوی شہریت ہے الگ ریاست نہیں۔

س: آپ جو کچھ نظریاتی اعتبار سے کہہ رہے ہیں وہ تو سمجھ میں آتا ہے لیکن مجھے ایک ذاتی سوال

پوچھنے دیجئے۔ میرے والدین نے آرمینیائی قتل عام کا سامنا کیا ہے وہ آرمینیا کے باشندے ہونے کے سبب سے زیرِ عتاب رہے۔اس سبب سے شدید ذکی الحس ہوگئے۔انہیں اپنی زبان، مذہب اور ثقافت کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ جب کبھی عوام قتل عام کا ہدف بنتے ہیں تو ان میں قبائلی تعلق کا احساس بڑھ جاتا ہے۔آپ کا کوئی دوست نہ ہو کوئی حلیف نہ ہو تو اپنوں سے یگانگت بڑھ جاتی ہے۔ میں نے آرمینیا کے ان باشندوں میں یہ احساس فزوں ہوتے دیکھا جن کے ساتھ میں پلا بڑھا۔

ج: یہ بالکل صحیح ہے لیکن آرمینیا کے لوگوں کے لئے بہت بڑا المیہ ہوتا اگر وہ ترکی میں آرمینیا کی قوم کے لئے الگ ریاست کے قیام کا مطالبہ کرنے لگتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اس ریاست کی ترکی کے ساتھ آج بھی جنگ ہو رہی ہوتی۔ آج آرمینیا کے لوگ ہیں جنہیں اپنی تاریخ پر فخر بھی ہے ان پر جو گزری اس کا غم بھی ہے اس المیے کا نتیجہ ہے کہ انہیں اپنی روایات کو سمجھنے اور دنیا کی متنوع ثقافتوں میں اپنے زندہ رکھنے کا جذبہ ملا۔ اب فرانسیسی آرمینیائی ہیں امریکی آرمینیائی ہیں لبنانی آرمینیائی ہیں۔ ان میں کئی چیزیں مشترک ہیں جو عالمی سطح پر انہیں ایک قوم کی حیثیت سے متحد رکھتی ہیں ایک قوم جو مختلف قوموں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کا کلچر مشترک ہے جس میں مشترک المیے کی یادیں بھی شامل ہیں اس طور پر میں فلسطینی ریاست کے قیام کے بھی حق میں نہیں۔

س: یعنی اگر یہ خالص فلسطینی ہو تو؟

ج: دراصل میری خواہش ہے کہ فلسطینی یہودیوں کے ساتھ مل کر رہنا سیکھ لیں خاص طور پر یہودی کیونکہ وہ اب فلسطین کا حصہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلسطین کا مستقبل یہودی اور فلسطینی کثیر القومیت میں ہے۔

س: ایڈورڈ سعید نے کہا ہے کہ یہ ستم ظریفی ہے کہ فلسطینی ان لوگوں کے مظالم کا شکار ہیں جو خود مظالم کے شکار رہے ہیں۔(1)

ج: یہ ستم ظریفی ضرور ہے لیکن تاریخ ایسی ستم ظریفیوں سے بھری ہوئی ہے تاہم یہ سب سے بڑی ستم ظریفی ہے۔

س: آپ مشرق وسطیٰ میں پھیلے ہوئے اس خیال کے بارے میں کیا کہتے ہیں کہ اسرائیل کے مخالف عرب دراصل سامی نسل کے مخالف ہیں۔

ج: یہ سراسر پروپیگنڈہ ہے عرب بھی سامی ہیں اور سامی زبان بولتے ہیں امریکہ میں اور اکثر مغربی یورپ کے ملکوں میں عربوں کو آپ یہودیوں کا سایہ پائیں گے۔

س: کس طرح؟

ج: جنگ عالمگیر سے پہلے مغربی ملکوں کے کارٹونوں میں یہودیوں کی جو اشکال پیش کی جاتی تھیں اور مغربی لٹریچر میں ان کی جو صفتیں بیان کی جاتی تھیں اب وہی کارٹون عربوں کے بن رہے ہیں۔ امریکہ میں ایک کارٹون میں عرب کو لمبی اور آگے سے قدرے جھکی ہوئی ناک والا آدمی دکھایا جاتا ہے یہ سامی ناک ہے۔1973ء سے 1975ء تک کے تیل کے بحران کے دوران عربوں کو نہایت امیر اور نہایت لالچی کے طور پر دکھایا جاتا رہا یہی ناک نقشہ آج بھی موجود ہے اور ویسا ہی دکھایا جارہا ہے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا یہی سراپا یہودی کا بھی تھا۔ امریکہ اور مغرب کی عام زبان میں آج جس عرب کا ذکر آتا ہے کل ویسا ہی یہودی کا آتا تھا۔

س: امریکی وزیر خارجہ میڈلین البرائیٹ کہتی ہیں کہ دہشت گردی مستقبل کی جنگ ہے۔(2) ان کے ایک لیکچر کا عنوان تھا ''دہشت گردی ان کی اور ہماری'' پہلی دہشت گردی سے تو اکثر لوگ شناسا ہوں گے۔ ہماری (امریکہ کی) دہشت گردی کیا ہوگی؟(3)

ج: میں دوسری باتوں کے ساتھ اپنی دہشت گردی اور ان کی دہشت گردی کے بارے میں یہی کہتا ہوں کہ یہ آپس میں مل جاتی ہیں یہ ملاپ اتنا گہرا اور اتنی کثرت سے ہوتا ہے کہ یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے ''کہ کون'' کون ہے۔1986ء میں، میں رچرڈ بارنٹ کے ساتھ مل کر ''دی نیو یارکر (4) کے لئے افغانستان کی جنگ کے بارے میں لکھ رہا تھا۔ جس مہینے ہم اپنے مضمون کا مسودہ تیار کر رہے تھے افغان مجاہدین کا ایک وفد وہائٹ ہاؤس پہنچا ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ صدر رونالڈ ریگن (5) نے ان کی تعریف کی۔ 1988ء میں مسلمانوں کا یہ جہاد جس کے لئے امریکی حکومت نے 8 ارب ڈالر کی امداد دی تھی ختم ہو گیا۔ جیسے ہی یہ ختم ہوا امریکہ نے اپنا منافع سمیٹا اور واپس گھر آ گیا ''بدی کی سلطنت'' کمزور ہو گئی تھی اور لڑکھڑا رہی تھی مجاہدین کو دہشت گرد قرار دے دیا گیا۔1998ء میں ان کے کیمپ پر امریکی مزائیلوں سے حملہ کیا گیا۔(6) سو آپ اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

س: دی پروگریسو کے حالیہ شمارے میں آپ نے لکھا ہے ''اسامہ بن لادن'' آنے والی چیزوں

کی علامت ہے،اس سے کیا مطلب ہے؟

ج: امریکہ نے مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا میں بڑے زہریلے بیج بودیئے ہیں اب یہ بیج پھوٹ رہے ہیں اور بڑھ رہے ہیں بعض پھل پک چکے ہیں بعض پک رہے ہیں یہ کیوں بوئے گئے؟ ان میں کیا پیدا ہوا ہے؟ اور انہیں کون کاٹے گا؟ اس کا تجزیہ کیا جانا چاہیے۔ میزائیلوں سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

شاعری اور انقلاب

س: اب ہم اپنا موضوع بدلتے ہیں اور برصغیر میں صوفیا کی روایت پر بات کرتے ہیں۔

ج: اسلام میں عارفانہ روایت تصوف کہلاتی ہے۔(8) اس روایت کے پیروی کرنے والے صوفی کہلاتے ہیں اس لفظ کا ماخذ صوف ہے،جس کے معنی ہیں ''اون'' یہ لوگ سادہ، کھردرا اونی کپڑا پہنتے تھے اس لئے صوفی کہلاتے۔اسلام پر مستشرقین کے لٹریچر سے یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ ہندوستان میں بڑی تعداد میں لوگوں نے ڈرکر اسلام قبول کیا اس ضمن میں کہا جاتا ہے کہ ''اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ یہ غلط تاثر ہے۔ برصغیر میں اسلام کی اشاعت صوفیوں کی وجہ سے ہوئی ہے جو اپنی زندگی کی مثال کے حوالے سے تبلیغ کرتے۔ عام طور پر وہ دوسروں کا مذہب تبدیل کرانے والے نہیں تھے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جا کر رہتے اور ان کی خدمت کرتے۔خدمت ان کا شعار تھی وہ لوگوں سے کسی امتیاز کے بغیر مساوی برتاؤ کرتے اور ایک لائق تقلید مثال قائم کردیتے۔ ہندوستان میں ذات پات کی تقسیم تھی۔اچھوت سب سے نچلی ذات کے مانے جاتے تھے وہ صوفیا سے متاثر ہوئے صوفی غریبوں کو عزت، برابری اور معاشرتی وقار دیتے۔آپ برصغیر میں صوفیا کا بڑا اثر دیکھیں گے۔ ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش میں ہرجگہ آپ برصغیر میں صوفیا کا بڑا اثر دیکھیں گے۔ ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش میں ہرجگہ آپ کو خانقاہیں دکھائی دیں گی۔ میرے اپنے گاؤں میں ایک خانقاہ تھی مسلمان اور ہندو اپنے علاقے کے بزرگوں کا یوم ولادت اور یوم وفات بڑے خضوع وخشوع سے مناتے ہیں۔

س: مذہب کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہے؟

ج: میں سخت سیکولر ہوں لیکن میرے نزدیک سیکولر کے جو معنی ہیں وہی ہر ایک کے ہونے چاہئیں اپنے حقیقی معنوں میں اس کا ہرگز مطلب نہیں کہ آپ مذہبی نہیں یا آپ مذہب کے مخالف

ہیں۔ میرے نزدیک سیکولر کا معنی یہ ہے کہ ریاست کے قوانین اور معاشرے کے قوانین معاشرے کی ضروریات ملحوظ رکھ کر بنائے جائیں، کسی مذہبی تقاضے کے تحت نہیں۔ ریاست ہر ایک سے مساوی سلوک کرنے چاہیں عیسائی ہوں، یہودی ہوں، ہندو ہوں، مسلمان ہوں۔ قانون ہر کسی کے لئے مساوی طور پر بنایا جاتا ہے۔ یہی میرے نزدیک سیکولرزم ہے۔ اس اعتبار سے نہ اسرائیل سیکولر ریاست ہے اور نہ پاکستان لیکن امریکہ ہے۔

س: مذہب اور روحانیت میں کیا فرق ہے؟

ج: مذہب خاص طرز، خاص مذہبی رسوم اور خاص قاعدے کی پیروی کا تقاضا کرتا ہے روحانیت مذہب کی روح سے تعلق رکھتی ہے وہ اسے کسی سانچے میں ڈھالنے کی بجائے بین الاقوامیت سے آشنا کرتی ہے۔ جب ایک مسلمان پانچ وقت نماز ادا کرتا ہے تو وہ مذہب کی پیروی کر رہا ہوتا ہے جب ایک ہندو ہر صبح مندر میں جاتا ہے اور چڑھاوے چڑھاتا ہے تو وہ مذہب کی پیروی کر رہا ہوتا ہے جب آپ خالق کے بنائے ہوئے مظاہر پر غور کرتے ہیں یا روحانی اور اخلاقی انداز میں زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں تو یہ روحانیت ہے۔ میں اس لحاظ سے مسلمان ہوں کہ میرا کسی خاص طرز یا ظواہر سے کوئی تعلق نہیں میرا زیادہ تعلق روح سے ہے۔ میرے نزدیک بعض چیزیں روحانیت کی ذیل میں آتی ہیں۔ اسلامی تہذیب میں جو چیز آفاقی ہے وہ میرے نزدیک اہم ہے۔ لوگوں کے باطنی حواس کو ترقی دینے پر زور دینا اہم ہے۔ اعلیٰ اخلاقیات پر زور دینا بھی نہایت اہم ہے۔ یہ اقدار میرے نزدیک سیکولر ہیں اور مذہبی بھی۔ وہ بیک وقت اسلامی بھی ہیں اور فلسفیانہ بھی، جو سیکولر اسلامی اور سیکولر مغربی لٹریچر کے مطالعے سے واضح ہوتی ہیں۔

س: اقبال کے کئی اشعار ہیں جن پر آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں، ان کا ایک مشہور قطعہ ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ عشق نمرود کی آگ میں کسی تذبذب کے بغیر کود جاتا ہے جب کہ عقل چھت پر کھڑی سوچتی رہتی ہے۔ یہاں اقبال نے محبت اور عقل کا تقابل کیا ہے؟(9)

ج: یہ صوفی خیال ہے، اسلامی تصوف کا خیال۔ یہ عیسائی یہودی اور اور ہندو تصوف کے اعتبار سے بھی صحیح ہے، سبھی روحانی مسالک میں کئی قدریں مشترک ہیں، اسلامی تصوف میں ظاہر اور باطن کا فرق ہے۔ جو ظاہر ہے وہ اس کے خلاف ہے جو مخفی ہے۔ نیکی بدی کے خلاف،

اچھائی برائی کے خلاف، عشق یا محبت عقل کے خلاف۔ ان متخالف حقائق کا ایک دوسرے سے مقابلہ جاری رہتا ہے۔ یہ سب کچھ انسان کے اندر ہوتا ہے۔ ظاہر دکھائی دیتا ہے باطن دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن اس کے بارے میں قیاس کیا جاسکتا ہے اور اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انسانی شخصیت سیکھتی اور اپنی تربیت کرتی ہے اور جب باطن کے تضادات کو دور کرنے کے قابل ہوتی ہے تو عظمت حاصل کرسکتی ہے۔

صوفیانہ خیال میں محبت کو عقل پر ہمیشہ سبقت حاصل رہی ہے۔ اقبال نے کہا ہے کہ محبت تو نمرود کی آگ میں بے خطر کود جاتی ہے۔ جبکہ عقل ایک طرف کھڑی دیکھتی رہ جاتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ بعض صورتوں میں محبت و عشق کو عقل اور منطق پر قابو پالینا چاہیے۔

س: جب میں ہندوستان میں رہتا تھا تو میں نے دیکھا کہ وہ لوگ جنہیں علمی اعتبار سے ان پڑھ سمجھا جاتا تھا وہ اقبال، میر تقی میر، مرزا غالب یا فیض احمد فیض کے اشعار بڑے ماہرانہ انداز سے سناتے تھے۔

ج: میں آپ کو اپنے اوپر بیتی کہانی سناتا ہوں۔ جب میں چار برس کا تھا تو میں نے تشدد کی ایک واردات دیکھی جس میں میرے والد قتل کر دیئے گئے۔ اس کے بعد میرا جی پڑھنے سے اچاٹ ہوگیا ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ مجھے سکول بھیجا جائے میرے بڑے بھائی نے کہا کہ اسے سکول بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان کا اصل فقرہ یہ تھا کہ ہم ایک ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جو ان پڑھ ہے لیکن صاحب علم ہے۔ وہ وہی کچھ کہہ رہے تھے جو آپ کہہ رہے ہیں۔ ہم دیہی علاقے میں رہتے تھے ہندوستان کے غریب عوام کی بہت بڑی اکثریت بھی دیہات ہی میں رہتی تھی۔ ہندو، مسلم کوئی بھی لکھ پڑھ نہیں سکتا تھا لیکن بیشتر ہندو مہابھارت گا کر سنا سکتے تھے۔ اکثر مسلمان نہ صرف قرآن مجید پڑھ سکتے تھے بلکہ کئی آیات انہوں نے حفظ کر رکھی تھیں۔ اسی طرح الف لیلہ کی کہانیاں اور کئی شاعروں کا کلام انہیں زبانی یاد تھا۔ برصغیر، مشرق وسطیٰ اور پوری اسلامی دنیا میں شاعری لوگوں کی زندگی کا جزو ہے۔

س: سیاسی نقطۂ نظر سے اقبال کا، فرشتوں کا گیت اٹھو میری دنیا کے غریب کو جگا دو۔ کاخِ امرا کے درو دیوار ہلا دو۔ جنگ کی للکار ہے؟ (10)

ج: اس سے ظاہر ہے کہ اقبال اندر سے انقلابی تھے۔ وہ روایت اور جدیدیت کے سنگم پر

کھڑے ہیں وہ روایتی صوفی شاعر بھی ہیں جدید نیشنلسٹ شاعر بھی اور جدید انقلابی شاعر بھی، ان پر روایتی اثر مسلسل اور بغیر کسی تضاد کے ہے۔ وہ صوفی ہیں ان پر جدید اثر جدیدیت کے تضادات کے لئے ہوئے ہے۔ وہ مارکسسٹ ہیں مسلم نیشنلسٹ ہیں انڈین نیشنلسٹ بھی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تضادات نمایاں ہیں۔ بیسویں صدی کے پہلے عشرے کا جدید انسان جن تضادات کا شکار تھا اقبال پر بھی وہ اثر انداز ہوئے ''فرشتوں کا گیت'' بھی یورپ کی ان انقلابی لہروں سے متاثر ہے جو ایشیا میں بھی پھیلنے لگی تھیں۔

اقتدار کی بیماری

س: آپ نے ایک اصطلاح وضع ہے ''اقتدار کی بیماریاں'' Pathologies of Power اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟ (11)

ج: میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تیسری دنیا کے سیاست دان اور ادارے، افراد جو برسر اقتدار ہیں اور ادارے جو وہ چلا رہے ہیں وہ بیشتر وقت کسی معقول زبان میں اپنا اظہار نہیں کر سکتے۔ عراق کے صدام حسین جب ٹائپ رائٹروں کی خریداری کے لئے لائسنس لینا ضروری قرار دیتے ہیں تو یہ ایک مریضانہ فعل ہے۔ سعودی عرب یونیورسٹیاں کھول رہا ہے یہ ایک اچھی بات ہے لیکن اس ڈر سے کہ طلباء اکٹھے ہوں گے تو شاید سیاست پر بات کریں یا بغاوت کو موضوع سخن بنائیں اس لئے طلباء کو مسائل پر بحث سے باز رکھنے کے لئے انہیں اکٹھا بیٹھنے ایک دوسرے سے ملنے اور باہم تعاون کرنے سے روکنے کی ہر ممکن تدبیر کی جاتی ہے۔ لیکن یہ یونیورسٹیوں کے کرنے کے کاموں کے یکسر برعکس ہے۔

تیسری دنیا کے ادیب دنیا کی سب سے زیادہ پُرخطر جنس ہیں۔ قریباً تمام عرب ادیب ایک یا دوسری طرح جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ واحد عظیم ناول نگار جو سعودی عرب نے پیدا کیا ہے عبدالرحمٰن منیف ہے اس سے شہریت سلب کر لی گئی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی سیاسی اور سوشل ادارہ اپنے آپ کو تخلیقی عمل سے منقطع کر لے۔ منیف دمشق (شام) میں رہ رہے ہیں۔ ایک اور اہم ادیب ادریس شامی ہے وہ پیرس میں جلاوطن ہیں۔ کبھی کبھی وہ بیروت چلے جاتے ہیں۔ پاکستان میں آزادی کے بعد سے شاید ہی کوئی اہم ادبی شخصیت ہوگی جو جیل میں نہ رہی ہو۔ میرے نزدیک یہ ریاست کی جانب سے مریضانہ طرز عمل کی

MashalBooks.org

صورتیں ہیں یہ قدرتی طرزِ عمل نہیں ہے۔

س: بنگلہ دیش کی ادیبہ تسلیمہ نسرین کا بھی مسئلہ ہے!

ج: جو کچھ ہو رہا ہے تسلیمہ نسرین اس کی تازہ ترین مثال ہیں۔ یہ کوئی معمول کا طرزِ عمل نہیں، خاص طور پر جب آپ سوچتے ہوں کہ ادیبوں کی اکثریت کوئی ایسی بات نہیں کر رہی جو ریاست کے لئے خطرے کا موجب ہو۔ تسلیمہ نسرین کوئی اچھی ادیبہ نہیں۔ انہوں نے ایک ناول لکھا ہے جس میں انہوں نے ان خطروں کا ذکر کیا ہے جو ہندو اقلیت کو مسلم اکثریت کے بنگلہ دیش میں درپیش ہیں (12) انہوں نے مبینہ طور پر ایک انٹرویو میں کچھ اس طرح کی بات کی ہے کہ وہ نہیں مانتیں کہ حضرت محمد ﷺ کی سنت اور روایات کی پابندی کرنا مسلمانوں پر لازم ہے۔ انہوں نے یہ کہا ہے یا نہیں، ہم نہیں جانتے، انہوں نے اس کی تردید کی ہے۔ پھر بھی انہیں باہر نکال دیا گیا ہے۔ (13) یہ سب مریضانہ طرزِ عمل ہے۔ میں ایسی کئی اور مثالیں دے سکتا ہوں۔ بے نظیر بھٹو نے ساڑھے تین برس کے دوران جب وہ وزیراعظم رہیں پاکستان ایسے غریب ملک کے دو ارب ڈالر لوٹ لئے یہ ایک مرض ہے۔ انہیں اس دولت کی ضرورت نہیں تھی وہ پہلے ہی ایک دولت مند خاتون ہیں۔

س: نواز شریف کہتے ہیں کہ ان کے خیال میں شریعت کا نفاذ پاکستان کے لئے بہت اچھا رہے گا۔

ج: نواز شریف نے جب آئین میں پندرھویں ترمیم پیش کی تھی تو میں نے اسی وقت لکھا تھا کہ اسلام دورِ جدید میں پاکستان اور دوسرے مسلمان ملکوں میں کمزور اور نابکار حکومتوں اور حکمرانوں کے لئے پناہ کا کام دیتا آیا ہے۔ وہ جب کبھی خطرہ محسوس کرتے ہیں، اپنے آپ کو یکا و تنہا محسوس کرتے ہیں، اپنی گرفت کو کمزور پڑتا اور مقبولیت کم ہوتے دیکھتے ہیں تو وہ اسلام کو سیاسی حربی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ نواز شریف یہی کچھ کر رہے ہیں۔ انہیں اقتدار میں آئے دو برس ہو گئے ہیں لیکن پاکستان کی اقتصادی حالت بہتر نہیں ہوئی۔ یہ بہت بری مشکل میں ہے۔ انہوں نے ایٹمی دھماکہ کیا لیکن پاکستان کی سلامتی کی حالت میں بہتری نہیں آئی، ہندوستان کے ساتھ ہمارے بنیادی تنازعات حل نہیں ہوئے۔ انہوں نے افغانستان میں طالبان کی حمایت کی جنہوں نے ہمیں ایران کے ساتھ تنازعے میں الجھا دیا ہے۔ ہم نے ایک اور ہمسائے کو اپنے خلاف کر لیا ہے اور اب تو ان پر نہایت شدید نوعیت کے الزامات لگ رہے ہیں۔ لندن آبزرور نے اپنے ایک آرٹیکل میں الزام لگایا

ہے کہ 1990ء میں نواز شریف نے اپنے پہلے دور حکمرانی میں بہت سی دولت لوٹی اور غیر ملکی بنکوں میں جمع کرادی (15) ان حالات میں نواز شریف اسلام کو جز دان سے نکال کر ملک میں اسلام کے نفاذ کا عمل شروع کر دیتے ہیں۔ سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کے استعمال کا یہ ایک روایتی انداز ہے۔

س: اقوام متحدہ میں پاکستان اور ہندوستان کے وزرائے اعظم نے سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنے کا عندیہ ظاہر کیا ہے۔ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔(16)

ج: میرا خیال ہے کہ وہ اس معاہدے پر دستخط کر دیں گے۔ واشنگٹن برسوں اپنے ترقی یافتہ ایٹمی اسلحے کے تجربات بند کرنے سے انکار کرتا رہا آخر میں اس نے فیصلہ کیا کہ ایٹمی ہتھیاروں کے تجربات پر پابندی لگانے کا جامع معاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان پر بھی دباؤ ہے۔ لیکن یہ ایک بے معنی سی بات ہے۔ سی ٹی بی ٹی کسی ملک کو اسلحہ کے تجربے کرنے سے روکنے کا وسیلہ ہے لیکن آج کل تجربے کرنا ضروری نہیں رہا۔ ترقی یافتہ کمپیوٹر سسٹم کے ذریعے اصل تجربوں کی بجائے لیبارٹری میں سرد تجربات بھی نہایت کامیاب ثابت ہو چکے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک مسئلہ ہے۔ دوسرا مسئلہ معاہدے کی شرائط کا ہے جو اس طرح کی ہیں کہ کوئی بھی ملک تجربہ کرنا چاہے تو ان شرائط کو بہ آسانی پس پشت ڈال سکتا ہے۔ اس پر کاربند رکھنے کا کوئی وسیلہ نہیں۔ امریکہ ہندوستان اور پاکستان پر عائد اقتصادی اور ٹیکنالوجیکل پابندیاں اٹھالے تو دونوں ملک معاہدے پر دستخط کر دیں گے یہ دونوں ملکوں کے فائدے میں ہوگا لیکن اس سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اسلحے کی دوڑ ختم نہیں ہوگی۔

سری لنکا

س: سری لنکا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں آپ کا تجزیہ کیا ہے؟

ج: اس تصادم میں وہی منطق کارفرما ہے جو ہندوستان کی تقسیم میں تھی۔ شمالی نیشنلزم نے 1920ء، 1930ء اور 1940ء کے عشروں میں فروغ پانا شروع کیا۔ اس میں بودھ سنہالی روایات، تاریخی، آثار علامات شامل ہونے لگیں۔ اس سے تامل باشندوں کو جو اقلیت میں ہیں یہ احساس پیدا ہوا کہ انہیں سری لنکا کے نیشنلزم کے دھارے سے نکالا جا رہا ہے۔ تاملوں سے کہا جانے لگا کہ وہ سنہالی تشخص کے حق میں اپنا الگ تشخص ترک کر دیں اس صورت میں وہ سری لنکا کے شہری بن کر رہ سکیں گے سو اس طرح نزاع شروع ہوا۔

ہندوستان میں بھی شروع شروع میں یہی کچھ ہوا تھا۔ ہندو نیشنلزم ابھرا تو اس نے انڈین نیشنلزم میں انڈو مسلم تہذیب کے بجائے جس نے سات سو برس میں ترقی کی اور ایک واضح شکل اختیار کی تھی، ہندوازم کی علامات اقدار اور رسوم ورواج کو فروغ دینا شروع کر دیا اس طرح یہ کثیر الثقافتی نیشنلزم کی بجائے اپنے مواد کے اعتبار سے ہندو نیشنلزم بننے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے اپنے نیشنلسٹ محسوسات کے تحت ردِعمل کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ تاملوں سے بھی یہی کچھ ہوا ہے سری لنکا کے نیشنلزم کو 1920ء، 1930ء اور 1940ء مین سنہالی بنانے کے ردعمل میں تامل نیشنلزم پر پیدا ہوا۔

1983ء میں بڑی خوفناک صورت پیدا ہوئی بڑے شہروں خاص طور پر کولمبو میں وسیع پیمانے پر فسادات شروع ہو گئے جن میں بڑی تعداد میں تامل مارے گئے۔ وہ صرف اس لئے مارے گئے فسادات نے سنہالی اکثریت کے مقابلے میں تاملوں کی تعداد میں نمایاں کمی کر دی۔ اس پس منظر میں 1983ء کے فسادات کے بعد آپ لبریشن ٹائیگرز آف تامل ازم (ایل ٹی ٹی ای) کو ابھرتے دیکھتے ہیں۔

ایل ٹی ٹی ای ایک تشدد پسند مسلح دہشت گرد تنظیم ہے جو سری لنکا کے شمال میں تامل اکثریت کے علاقے کی علیحدگی کا مطالبہ کر رہی ہے اس طرح سری لنکا میں دوقومی نظریہ فروغ پا رہا ہے۔ اب سری لنکا میں دو قومیں ہیں ایک تامل دوسری سنہالی، میرے خیال میں ایل ٹی ٹی ای کو سری لنکا میں رہنے والوں کی غالب اکثریت کی حمایت حاصل نہیں لیکن متشدد نیشنلسٹ تنظیم ہونے کے حوالے سے اس نے اپنی حیثیت قائم کر لی ہے اور علیحدہ ریاست کو اپنا مطمح نظر بنالیا ہے مقامی تامل تو اس کا ساتھ نہیں دے رہے لیکن باہر سے آ کر بس جانے والے تامل اس کے پرجوش حامی ہیں۔

دنیا میں عجیب وغریب صورتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ آبادی کی نقل مکانی سے دنیا بھر میں نیشنلزم کی نوعیت بدلنے لگی ہے۔ کینیڈا، امریکہ اور برطانیہ میں سری لنکا کے لوگ بھاری تعداد میں بس گئے ہیں ان میں زیادہ تر تعداد تاملوں کی ہے جو ایل ٹی ٹی ای سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ اس وقت ٹائیگرز ساحلی علاقوں میں آباد ہیں اور منشیات اور اسلحے کی غیر قانونی تجارت میں ملوث ہیں انہیں زیادہ پیسہ اس کاروبار سے ملتا ہے اسلحے کے معاملے میں وہ بڑی حد تک خود کفیل ہیں ان کی تنظیم کو شکست دینا آسان نہیں۔ گزشتہ ڈھائی برس سے سری لنکا کی

حکومت نے تاملوں کے اکثریتی علاقے جافنا کے بڑے شہر پر قبضہ کر رکھا ہے یہاں بلدیاتی انتخابات ہوتے ہیں نئے میئر چنے جاتے ہیں لیکن ایل ٹی ٹی ای انہیں قتل کرتی اور مار بھگاتی رہتی ہے اس طرح سری لنکا کی زندگی میں تشدد اور دہشت کا سلسلہ جاری ہے جو ختم ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

س: کیا آپ تقسیم کو مسئلے کا پائیدار حل سمجھتے ہیں؟

ج: میں تقسیم کو مسئلے کا پائیدار حل تسلیم نہیں کرتا۔ اب تک ایل ٹی ای ای اور سری لنکا کی حکومت کے درمیان مذاکرات ہونے کے آثار نظر نہیں آتے کہ تشدد کے خاتمے کی اُمید کی جا سکے صدر چندریکا کمارا تنگا گزشتہ ساڑھے تین سال سے برسراقتدار ہیں اس عرصے میں ایک طرف سختی اختیار کر رکھی ہے دوسری جانب مذاکرات کا دروازہ بھی کھلا رکھا ہے وہ تاملوں کو زیادہ خودمختاری دینے اور ان کے مقبوضہ علاقوں پر زیادہ کنٹرول دینے کی بنیاد پر تاملوں سے تصفیہ چاہتی ہیں لیکن ایل ٹی ٹی ای نے آمادگی ظاہر نہیں کی۔ اسی دوران کمارا تنگا نے سخت فوجی اقدامات کئے ہیں تاکہ تاملوں کو مذاکرات کی میز پر لایا جا سکے ان کی نرم اور مذاکرات پر آمادگی کی پالیسی اور فوجی محاذ پر سختی برتنے کی پالیسی کا کوئی اثر ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔

بلقان میں نسلی اختلاف

س: اب اختلاف کے ایک دوسرے علاقے پر توجہ کرتے ہیں۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا رہا ہے کہ سوویت اقتدار کے دور میں سوویت یونین کے اندر اور اس کی حلیف ریاستوں میں نیشنلسٹ اور علیحدگی کے رجحانات سوویت طاقت کی وجہ سے دبے رہے تھے۔ سوویت یونین کے خاتمے کے ساتھ نیشنلزم سامنے آ گیا ہے کوسک اور بلقانی ریاستوں میں خاص طور پر اس کا اظہار کھل کر ہونے لگا ہے۔ آپ اس صورتحال کے بارے میں کیا کہیں گے۔

ج: اس میں شک نہیں کہ سوویت یونین اور مشرقی یورپ میں کمیونزم کے خاتمے سے جو ماحول پیدا ہوا ہے اس میں نسلی نیشنلزم پھل پھول سکتا ہے لیکن یہ بنیادی مسئلہ نہیں۔ بعض اختلافات اور تصادم جیسا کہ چیچنیا میں نمایاں ہوئے ہیں بہ آسانی سمجھے جا سکتے ہیں چیچن سمجھتے ہیں کہ روس میں ان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جا رہا ہے اس لئے انہوں نے بغاوت کر دی۔ پہلے تو انہوں نے خودمختاری کا مطالبہ کیا اور آخر میں آزادی کا مطالبہ کرنے لگے انہوں نے جھگڑا ختم کرنے کے لئے بات چیت کی ہے اس لئے بھی کہ روسی ریاست

MashalBooks.org

اتنی کمزور ہے کہ فوجی کارروائی جاری نہیں رکھ سکتی۔ دوسرے دونوں طرف سمجھدار عناصر بھی ہیں جو کسی قسم کا معاہدہ کرنے کی ضرورت کا احساس رکھتے ہیں۔

بلقانی ریاستوں کا معاملہ قدرے پیچیدہ ہے۔ یوگوسلاویہ کا سرب لیڈر ملوسووچ پرانی طرز کا سخت گیر فسطائی ہے وہ ہٹلر کی طرز کا جاہ پسند سیاست دان ہے کمیونزم کے خاتمے کے بعد اس نے یوگوسلاویہ کو بحران کا شکار ہوتے دیکھا اس طرح جو خلاء پیدا ہونے لگا اُسے پُر کرنے کے لئے اس نے سرب نیشنلزم کے بدترین پہلوؤں کو اُبھارا۔ مطلب یہ ہے کہ اس نے کروٹس اور مسلمانوں کے خلاف سربوں کی نفرت کو ہوا دی چنانچہ کوسووکے مسلمان عتاب میں آئے۔1980ء کے اواخر میں ملوسووچ نے مسلمانوں کے خلاف سربیا کی نفرت اُبھارنا شروع کی اور یوں کوسود میں اپنے اقتدار کی بنیاد رکھی۔

بلقانی ریاستوں میں یہ وحشت ناک واقعات اس لئے رونما ہوئے کہ ملوسووچ کے مظالم کے زیادہ شکار مسلمان تھے۔ مغرب کو مسلمانوں کے بارے میں اتنی تشویش نہیں تھی جتنی عیسائیوں کے بارے میں تھی۔ مغرب کی جذباتی تعمیر میں فرقہ پرستی شامل ہے۔ اس کا تسلسل اس کی مضبوط جڑیں نسل پرستی اور مسلم دشمن جذبات کی طرح مغرب کے ذہن اور سیاسی کلچر کا حصہ چلی آ رہی ہیں۔ اسی نے بلقانی ریاستوں میں ظلم وتشدد کی آگ بھڑکائی۔

اس بحران کا دوسرا سبب1990ء میں جرمنی کا اتحاد اور روس سے اس کے مخالفانہ تعلق کا خاتمہ تھا۔ جرمنی کے اتحاد سے مغربی یورپ میں یہ پرانا ڈر عود کر آیا کہ جرمنی کا عروج یورپی ملکوں کے لئے نئے خطروں کا موجب ہوگا۔ یہ خوف برطانیہ اور فرانس میں زیادہ تھا۔ چنانچہ دسمبر 1991ء میں جرمنی نے کروشیا کو تسلیم کیا تو اس خوف میں مزید اضافہ ہوگیا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ جرمنی اپنے حلقہ اثر کو پھیلانے لگا ہے۔ اس لئے جرمنی کے روس سے توازن برقرار رکھنے کی تدبیر کی جانی چاہیے اس لئے روس کو اپنا اثر سربیا کے علاقے تک بڑھانے کی ترغیب دی گئی۔ سربیا کے تعلق میں روس کی ہمدردی نے مغرب کو یہ دیکھنے سے باز رکھا کہ سربیا قتل عام میں ملوث ہے دیکھا بھی تو انہوں نے کچھ کہا نہیں۔

آج تک کے اخباروں میں ایڈیٹوریل میں دیکھ رہا ہوں جن میں پوچھا جا رہا ہے کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ملوسووچ ناقابل اعتماد ہے، ہم اس سے معاملہ کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں ملوسووچ فسطائی ہے اس نے کبھی کوئی وعدہ پورا نہیں کیا وہ ہمیشہ جوڑ توڑ کرتا آیا ہے

واشنگٹن اس سے ابھی تک کیوں مذاکرات کر رہا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ امریکہ مضبوطی سربیا کو قائم رکھنا چاہتا ہے تا کہ یہ روس کے ساتھ مل کر مضبوط جرمنی کے مقابلے میں توازن قائم رکھنے کا وسیلہ ثابت ہو سکے۔

س: یہ علاقائی اور جغرافیائی ضرورت ہے؟

ج: بدقسمتی سے یہ خیالی ضرورت ہے ہم اس کی وضاحت نہیں کر سکے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے شروع کی سیاست بیسویں اور اکیسویں صدی کی سیاست نہیں ہمارے وقت کا مرکزی مسئلہ یہ ہے کہ فیصلہ کرنے والوں کے سیاسی دماغوں کی جڑیں ماضی میں ہیں جب کہ ماضی کی منطق بدل چکی ہے۔ جدید ٹیکنالوجی جدید معاشیات جدید نظریات نے اسے تبدیل کر دیا ہے لیکن ہم یورپ کو طاقت کے توازن کی سیاست کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر جرمنی متحد ہوتا ہے تو اس سے توازن کا میکنزم تلاش کرنا چاہیے۔ امریکہ یورپ میں دلچسپی لیتا رہا ہے اس لئے ہم نے 1990ء کے عشرے میں نیٹو کی توسیع کا اہتمام کیا۔

س: فرض کیجئے کہ بوسنیا کا قصبہ بانیالوکا، یہودی عبادت گاہوں اور سولہ گرجا گھروں سمیت تباہ ہو جاتا تو اس کے خلاف کیا ردِعمل ہوتا؟ دراصل وہاں سولہ مسجدیں تباہ ہوئیں۔(17)

ج: یہاں اعداد و شمار اہمیت نہیں رکھتے۔ یورپ میں اسلامی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ مسجد فرحت پاشا 1993ء میں پیوند زمین کر دی گئی۔ پوچھنا چاہیے کہ یورپ میں اگر فرانسس آف اسیسی کا گرجا یا روم کا بڑا کتھیڈرل تباہ کیا جاتا تو کیا ردِعمل ہوتا؟ وہاں شدید غم و غصے کا اظہار کیا جاتا۔ سرائیو نیشنل لائبریری کا خیال کیجئے جو سرب بمباری سے مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔ یہاں از منۂ وسطیٰ کے بہتر اسلامی اور یہودی مخطوطے تھے۔ کسی نے ان کی طرف دھیان نہیں دیا۔ یہ یورپ کی بڑی قومی لائبریری تھی جسے تباہ کر دیا گیا اس کی کتابیں نذر آتش کر دی گئیں۔ یہ بیسویں صدی کی آخری دھائی میں ہوا اور دنیا نے اس طرح کا تاثر دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ذرا سوچئے سربرنیکا میں اقوام متحدہ کی اس فوج کی موجودگی میں جو کچھ ہوا۔ تین چار دن کے اندر ہزاروں لوگوں کا قتل عام کر دیا گیا۔ یہ غیر معمولی واقعات تھے اور ایسے وقت ہوئے جب یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔(19)

س: بلقانی ریاستوں، خاص طور پر بوسنیا کی جنگ جیسے ہی واقعات روانڈا میں ہو رہے تھے۔ (20)

ج: جی ہاں ایک ہی طرح کی لاتعلقی اور سنگدلانہ بے التفاتی ایک عرصے تک چھائی رہی جب اس طرف توجہ ہوئی تو اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ کوسوو پر نگاہ کیجئے جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ ملوسووچ نے اپنی نفرت کی سیاست 1980ء کے اواخر میں یہیں سے شروع کی تھی اس نے نسل کشی کا آغاز بھی اس کے ساتھ ہی کیا تھا۔ نفرت کی تحریک جسے وہ سربیا نیشنلزم کہتا تھا اس کی ابتداء بھی یہیں سے ہوتی تھی۔ 1991ء سے جب ہم بوسنیا میں قتل عام کا مشاہدہ کررہے تھے علاقے کے ہر باخبر مبصر نے یہی کہا کہ ہمیں کوسوو کے مسئلہ پر نظر کرنی چاہیے۔ ایک یا دوسرے دن ملوسووچ کی حکومت، نسلی کشی ایک نیا دور شروع کرے گی۔ اس لئے وقت ہے کہ مسئلے کا حل تلاش کیا جائے۔ ملوسووچ کوسوو صوبے کی خودمختاری ختم کرنے اور یہاں فوجی اور پولیس راج قائم کرنے کے درپے ہے۔ دنیا کے دیکھتے ہوئے یہ واقعات رونما ہوں گے حتیٰ کہ قتل عام شروع ہو جائے گا۔

بین الاقوامی یکجہتی

س: جب آپ موجودہ عالمی منظر پر نظر ڈالتے ہیں تو کیا آپ نئے لبرل ایجنڈے کے لئے کوئی مزاحمت کی حکمت عملی تجویز کرتے ہیں؟

ج: مزاحمت کی حکمت عملی کے لئے حلقے کا تعین کیا جاتا ہے۔ مجھے مزاحمت کے حلقے کی پہچان کرتے ہوئے مشکل پیش آتی ہے۔ بوسنیا کا معاملہ لیجئے جدید دور کے تمام قتل عام اپنے اندر پرانے دور کی نشانیاں ہی رکھتے ہیں۔ ہٹلر کے یہودیوں اور خانہ بدوشوں کے قتل عام کی معینہ علامت، نظربندی کیمپ اور گیس چیمبر تھے۔ بوسنیا میں قتل عام کی معینہ علامت نظربندی کیمپ اور عورتوں کی بے حرمتی کے کیمپ تھے۔ یہ پہلا موقعہ ہے کہ عورتوں کی بے حرمتی کو نسلی جنگ میں منظّم ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ یہ 1990ء کے اوائل میں ہوا جب مغربی دنیا میں خاص طور پر عورتوں کی مہم اپنے عروج پر تھی۔ ایک مثال یہ ہے کہ بل کلنٹن نے اپنی صدارتی مہم اس وعدے سے شروع کی تھی کہ وہ بوسنیا پر سے پابندی اٹھالیں گے۔ ہتھیاروں کی پابندی سے بوسنیا کو مشکل پیش آ رہی تھی۔ کروٹس اور سربوں کو نہیں۔ بل کلنٹن نے اس پالیسی کی بھی ترجمانی کی کہ پابندی اٹھاؤ اور حملہ کرو مطلب یہ تھا کہ ہتھیاروں پر عائید پابندی اٹھالی جائے اور سرب توپ خانے پر فضائی حملہ کیا جائے جو سرائیوو پر گولے برسا رہا ہے۔ کلنٹن نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا، ایک ماہ بعد وہ وائٹ ہاؤس

میں آئے تو امریکہ کے مختلف حصوں کی عورتوں کی تحریک نے بچہ پیدا کرنے یا نہ کرنے کے حق کے لئے واشنگٹن کی طرف مارچ شروع کیا، میرا خیال تھا کہ عورتیں بے حرمتی کے کیمپوں کا مسئلہ اُٹھائیں گی۔ صدر کلنٹن اور ان کی بیوی نے عورتوں کے ایک وفد کو ملاقات کا موقعہ فراہم کیا لیکن وفد نے بے حرمتی کے کیمپوں یا بوسنیا کا ذکر تک نہ کیا۔ یہاں ایک گروپ تھا جو حقوق کے تحفظ کی ضرورت کا شعور رکھتا تھا۔ لیکن اس نے عورتوں سے متعلق ایک نہایت اہم مسئلے کو نظر انداز کر دیا۔ میں تقابل کے طور پر بتانا چاہوں گا کہ چند ہفتے بعد واشنگٹن میں جرمنی میں یہودیوں کے قتل عام کے متعلق ایک میوزیم کا افتتاح ہوا کلنٹن اس کا افتتاح کرنے آئے، یہودی لیڈروں نے یکے بعد دیگرے اپنی تقریروں میں جہاں صدر کلنٹن کا خیر مقدم کیا وہاں اس امر پر بھی زور دیا کہ بوسنیا میں قتل عام روکنے کے لئے کچھ کیا جائے۔ میں ان لوگوں کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے زبان کھولی۔ اب آپ کے سوال کی طرف آتے ہیں، میں حیران ہوں کہ عوام میں بین الاقوامی اتحاد و اتفاق کا شعور کیسے بحال کیا جائے، جو قدرتی طور پر ان میں موجود ہونا چاہیے۔ اسے کسی نہ کسی طرح بحال کرنا چاہیے۔ عورتوں نے اپنے حقوق کی خاطر ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں واشنگٹن کی طرف مارچ کیا لیکن بوسنیا کا ذکر نہ کیا ایک ایسے وقت جب کہ وہاں قتل عام ہو رہا تھا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ بین الاقوامی اتحاد و اتفاق کا شعور عوامی تحریکوں میں کم ہو گیا ہے اسے بحال کرنا ہوگا۔ یہ پہلا قدم ہے۔ یہ شعور کم کیوں ہوا؟ اس کی کئی وجوہ ہیں یہ روس اور امریکہ کے درمیان جنگ کا خطرہ ختم ہو جائے یا ایٹمی ہتھیاروں کا ڈر ختم ہو جانے کا نتیجہ ہے۔ ان محرکات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ قبل ازیں ہر بین الاقوامی تصادم اور بحران میں یہ پیغام شامل ہوتا تھا کہ ایٹمی جنگ کا بٹن کسی بھی وقت دب سکتا ہے۔ یہ بٹن نکال دیا گیا ہے لیکن اس کے سبب سے بین الاقوامی اتحاد و اتفاق ختم نہیں ہونا چاہیے۔

فرد پرستی کا کاروبار

س: فرائیڈ ''معمولی اختلافات کی خود پسندی'' کا ذکر کرتا ہے۔

ج: اس کی یقیناً کارفرمائی ہے۔ (20) میرے خیال میں مسئلہ اس سے بھی بڑا ہے۔ وہ تحریک جس سے ہم پیدا ہوئے ہیں 1960ء کے عشرے کی تحریک خود پسندی کی بازگشت کی تحریک تھی۔ امریکی معاشرے میں آج بھی خود پسندی کا رجحان موجود ہے۔ یورپ کے تعلق میں

MashalBooks.org

بھی یہ سچ ہوسکتا ہے۔ لیکن میں یورپ کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ خود پسندی کی جڑیں سرمائے میں موجود ہیں، اشیائے صرف کی خرید وفروخت میں ہیں۔ آپ ٹیلی ویژن کا سوئچ آن کریں تمام اشتہارات آپ کے انفرادی آرام وآسائش اور خوشی کے لئے ہیں یہ دن رات بچوں اور بڑوں کو مخاطب کرتے ہیں ان کا اثر ہمارا ذہن بناتا ہے ذات، خاندان چھوٹے گروپ سے ماورا۔ اتحاد واتفاق کا خیال جدید امریکی سوسائٹی سے غائب ہوتا جارہا ہے۔

لوگوں کا اقتصادی ماحول سے رشتہ بہت ہی صورتوں میں بدل گیا ہے۔ زرعی دور میں اور صنعتی سوسائٹی سے پہلے آدمی تعاون اور اجتماع کا ایک یونٹ تھا۔ زرعی پیداوار کے طریقوں کا تقاضا تھا کہ لوگ باہم تعاون کریں تاکہ پیداوار حاصل کرسکیں اور زندہ رہنے کا سامان مہیا کرسکیں جب فصل پک جاتی ہے تو پورا گاؤں فصل کاٹنے میں ایک دوسرے کی مدد کرتا ہے اور ایک دوسرے سے تعاون کرتا ہے۔ بیج بونے کے وقت بھی یہی ہوتا ہے یا جب سیلاب آتا ہے تو آپ کو اپنے تحفظ کے لئے اجتماعی وسائل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ پیداوار کا ایک خصوصی طریقہ مردوں اور عورتوں کے لئے تعاون کا کردار طے کرتا ہے۔ اس خصوصی سیاسی کلچر اور ماحول میں تعاون ضروری تھا۔

اس کے بعد آپ صنعتوں کے قیام کی طرف بڑھتے ہیں۔ صنعتی دور میں ایک فرد کو پیداوار کے یونٹ کی حیثیت میں اہمیت حاصل ہوجاتی ہے۔ مینوفیکچرنگ سیاسی معاشیات کا مرکز ومقصد ہے یہاں بھی آپ فرد کو پیداواری یونٹ کی حیثیت دیتے ہیں آپ فرد کے ہنر میں دلچسپی رکھتے ہیں اس کی پیداواری صلاحیت کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں اور بیسوی صدی کے پہلے نصف میں بڑی کارپوریشنوں کی تحقیق کا پیشتر مقصد فرد کی پیداواری صلاحیت بڑھانا اوقات کار، کام کے گھنٹے، ہنر اور صلاحیت میں اضافہ، کام کا ایک ہی انداز اور مناسب روشنی کا انتظام تھا۔ اس وقت ساری تحقیق کا محور صنعتی پیداوار بڑھانا رہا۔

1950ء کی دہائی سے اس عمل میں قدرے تبدیلی آئی ہے۔ کارپوریشنیں اب فرد کے پیداواری یونٹ کی حیثیت میں خرچ کرنے اور انسانوں کو صارف بنانے پر زیادہ توجہ دینے لگی ہیں۔ اکثر کارپوریشنوں کی تحقیق کا محور پیداوار بڑھانے کی بجائے اشیا فروخت کرنا

MashalBooks.org

بن گیا ہے۔

س: امریکہ کی سات کھرب ڈالر کی معیشت ہے۔ایک کھرب ڈالر یعنی معیشت کا ساتواں حصہ مارکیٹنگ پر خرچ کیا جارہا ہے۔

ج: جب آپ پیداواری یونٹ کی حیثیت سے فرد کے کردار پر زور دیتے ہیں تو آپ اس کے بیرونی رشتوں میں بھی دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔مثال کے طور پر اس کے ہنر میں، اس کی دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی صلاحیت ہیں۔مل جل کر کام کرنے کے بغیر پیداوار ممکن نہیں۔جب آپ فرد کے بحیثیت صارف کردار کا ذکر کرتے ہیں تو دراصل آپ کی توجہ ایک فرد کی خود بینی پر، اس کے جنسی رجحان پر، اس کی خود پرستی پر، والدین کے اولاد سے تعلق پر بچوں کے والدین سے تعلق پر، بیوی کے خاوند سے رشتے پر، خاوند کے بیوی سے رشتے پر، ایک فرد کے اس کی موٹر کار سے تعلق پر ہوتی ہے۔یہ سارا عمل ذات کے ارتکاز کا سبب بنتا ہے۔یہ آپ کی نفسیات میں داخل ہوجاتا ہے اور یوں فرد کے تخلیے پر اثر انداز ہوتا ہے۔اسے آپ آمرانہ عمل بھی کہہ سکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ دنیا بھر میں جمہوری عمل کو اس سبب سے خطرہ لاحق ہے کہ سوسائٹی کے بڑے بڑے ادارے لوگوں کی نجی زندگی میں داخل ہو کے انہیں صارف بنانے کی کوشش میں لگے ہیں۔اگر میں آپ کے صارف ہونے کے تعلق سے آپ میں دلچسپی رکھتا ہوں تو میں آپ کے آپ کی بیوی سے تعلق میں آپ کے جنسی رجحان سے اور آپ کی خود پسندی سے بھی دلچسپی رکھتا ہوں۔یہ سب داخلی معاملات ہیں۔جب طاقت کے بیرونی ادارے افراد کی نجی زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں جمہوریت رک جاتی ہے اور آمریت کا آغاز ہوجاتا ہے۔اس عمل کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ عمل فرد کے اندر بھی نرگسیت یا خود پسندی پیدا کرتا ہے یہ ذات پر ارتکاز وتوجہ کا موجب بنتا ہے۔میں میں، ہم، ہم، ہمارا، ہمارا، حقیقی احساسِ اتحاد واتفاق پیدا کرنے کو مشکل بنا دیتا ہے۔1994ء میں، میں نے امریکی خواتین کے ایک گروپ سے بوسنیا کے بارے میں باتیں کیں۔میں انہیں ہم خیال جان کر قدرے تلخ ہوگیا تھا۔مجھے اس بات کا صدمہ ہوا کہ ان میں سے بعض خواتین ناراض ہوگئیں لیکن ان کی اکثریت میٹنگ سے غور وفکر کرنے کا احساس لے کر گئی۔ہماری بنیادی ضرورت دوسروں تک رسائی حاصل کرنے کی ہے انہیں سننے کے اور اُن سے اتحاد واتفاق پیدا کرنے کی ہے۔لیکن

موجودہ ماحول میں یہ مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ بہر حال ہمیں کوشش ضرور کرنی چاہیے۔

س: وندنا شیوا نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ ہمیں عمومیت اور اشتراک کو تلاش کرنا اور اسے بحال کرنا چاہیے وہ احاطے اور مشترک جائیداد کے گرد حصار باندھنے کو ایک مسئلہ قرار دیتی ہیں۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ (20)

ج: یہ ایک اچھا خیال ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ماحول پر نظر کرنے کے اپنے طور طریقے بدلیں۔ یہ مسئلہ ہے کہ ذرائع ابلاغ ایک خاص چیز کو کتنے بُرے انداز سے پیش کرتے ہیں لیکن اصل میں جس پہلو کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے وہ طریقے ہیں جو اشتہارات، کارپوریشنیں اور ذرائع ابلاغ اس ماحول سے جس میں ہم رہ رہے ہیں ہمارے رشتے کی نوعیت کو بدل رہے ہیں۔ یہ بہت اہم اور دانش مندانہ فریضہ ہے جسے ادا کرنا چاہیے اور جس میں ہم میں سے بہت کم شریک ہیں۔

س: کیا آپ سوچتے ہیں کہ ماحول کے مسائل مثلاً اوزون گیس کا کم ہونا اور کرۂ ارض کا گرم ہونا عالمی اتحاد و یگانگت پیدا کرنے میں اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اگر کرۂ ارض کا گرم ہونا پاکستان پر اثر انداز ہو رہا ہے تو یہ امریکہ اور ارجن ٹائن کو بھی متاثر کر رہا ہے۔

ج: آپ نے بالکل صحیح کہا ہے لیکن جب تک اتحاد و یگانگت کے احساس میں وسیع پیمانے پر شرکت نہیں کی جاتی اس وقت تک ماحول سے متعلق تشویش کو عالمی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ امریکی دنیا بھر میں سب سے زیادہ خام مال استعمال کرنے والے صارفین ہیں۔ ماحولیاتی تحریک کو زور پکڑے دس سال ہو گئے ہیں اس نے امریکیوں کی استعمالات کے عمومی انداز میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ ہم ماحول کے بارے میں باتیں تو کرتے ہیں لیکن یہ دیکھنے پر تیار نہیں کہ ہماری معیشت اور ہماری زندگی ماحول پر کیا اثرات مرتب کر رہی ہے۔ ہم ماحول کی فوری نوعیت کی ضرورتوں پر تو دھیان دیتے ہیں لیکن ہمالیہ جیسے بڑے مسائل کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ جب تک شعور میں تبدیلی نہیں آتی۔ ہم توجہ کر بھی نہیں سکتے۔ ماحول کے تعلق میں آلات و وسائل کو بروئے کار لانا ضروری ہے مگر یہ کافی نہیں۔

س: جب کوئی فرد صارف کی ذاتی پسند کے حصار سے نکل آنے کی کوشش کرتا ہے اور خود پسندی چھوڑتا ہے تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟

ج: ہوتا یہ ہے کہ انفرادی سطح پر آپ کی زندگی اچھی ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ اسے وسیع تر اجتماعی زندگی میں زیرِ عمل لانے کے لئے کیا کرتے ہیں۔ اپنے تجربے اور قدروں کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے کیا کرتے ہیں۔ اس کے لئے آپ ریڈیو سے کام لیتے ہیں اطلاعات پہنچاتے ہیں اور اس عمل میں اگر خطرہ درپیش ہو تو وہ بھی مول لے لیتے ہیں۔ خطرہ مول لینا ہماری زندگی کا حصہ بننا چاہیے کیونکہ جب تک ہم خطرہ مول نہیں لیتے ہم خیر و خوبی کا کوئی کام انجام نہیں دے سکتے۔ عام طور پر خطرہ مول نہیں لیا جاتا لیکن اسے لینے کی خواہش رکھی جا سکتی ہے۔

انتونیو گرامچی اور البیر کامو

س: چند ایسے لوگ ہیں جن کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ پہلا انتونیو گرامچی ہے۔ ایک اور انٹرویو میں آپ نے کہا ہے کہ اسے سنجیدگی سے نہیں لیا گیا اور اسے مبہم بھی کہا گیا آپ کی گرامچی کے بارے میں کیا رائے ہے؟(23)

ج: میں آج تک اس سے سیکھ رہا ہوں۔ گرامچی بیسویں صدی کے نظریہ سازوں میں سب سے اہم شخص ہے۔ مشل فوکو اور دوسروں سے بھی اہم جو اس کے بعد آئے۔ طبقاتی کشمکش پر اسے مکمل دسترس حاصل ہے۔ کمزوری پر طاقت کے، غربت پر دولت کے۔ شہری معاشرت پر ریاست کے اثر کے محرکات اور مضمرات پر بھی اس کی گہری نظر ہے ہمارے دور کے جتنے بھی ہم نظریہ ساز ہیں ان میں سے وہ واحد شخص ہے جو غریب پس منظر رکھتا تھا۔ وہ واحد ہے جو لوگوں کی روزمرہ کی جدوجہد میں شریک رہا وہ اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اُس نے کئی سال جیل بھی گزارے، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں ان تجربات نے ان کی عمیق نظری کو ایک خاص انداز دیا ہے جو کئی اعتبارات سے امتیازی ہے۔ اس کی تحریر بظاہر بے ربط اور مغلق ہوتی ہے کہ اُسے پڑھنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ تاہم اس کی تحریریں اپنے مطالب و معانی کے لحاظ سے اتنی اعلیٰ و عمدہ ہوتی ہیں کہ ان سے روشنی نکلتی محسوس ہوتی ہے مجھے اس کا مضمون سمجھنے کے لئے دو تین بار پڑھنا پڑتا ہے۔

س: خطروں کے بارے میں آپ کی رائے کے ضمن میں گرامچی کا یہ مقولہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ ''انسان کو فکر و دانش میں قنوطی لیکن ارادے کے اعتبار سے خوش امید'' ہونا چاہیے۔(24)

ج: یہ متناقض بات بہت ہی اچھی ہے۔ کیونکہ وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ ہم ایک بیہودہ دنیا میں رہ

MashalBooks.org

رہے ہیں جو غلاظت سے بھری ہے۔ ایک ناقدانہ ذہانت کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے گرد پھیلی ہوئی گندگی کو پہچان لے تاکہ ہم اسے صاف طور پر دیکھ سکیں اس کے زیر اثر نہ آئیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اسے صاف کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کرسکے تو وہ مزید سخت ہوجائے گی۔ ذہانت کی قنوطیت ناقدانہ ذہانت کا تقاضہ کرتی ہے۔ حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اصلی اور حقیقی حقانیت کا ادارک کرتی ہے۔ نومیدی یا خوش امیدی بنیادی سچائی سے تعلق استوار کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ یہ ایک تخلیقی متناقض بات ہے جس سے اچھائی کا ظہور ہوسکتا ہے۔

س: ایک اور دلچسپ شخصیت البیئر کاموکی ہے وہ اوران الجزائر میں پیدا ہوا۔ وہ نازی دشمن تحریک مزاحمت کا رکن تھا اور فرانس میں ڈیموکریٹک لیفٹ سے وابستہ تھا لیکن اپنے وطن الجزائر کے بارے میں تضاد خیالی کا شکار تھا۔ اس نے ایک بار کہا تھا کہ سزا دینے والوں اور سزا پانے والوں کی دنیا میں سوچ سمجھ رکھنے والوں کو سزا دینے والوں کا ساتھ نہیں دینا چاہیے۔ لیکن جب الجزائر میں فرانس کا مسئلہ آیا تو وہ سخت مشکل میں گھر گیا۔(25)

ج: وہ اس پر سخت تضاد خیالی کا شکار رہا۔ اس کے اندر فرانسیسی نیشنلزم اور معاشرتی شعور میں جنگ جاری رہی۔ میں جب پیچھے دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ فرانسیسی کلچر اس پر اتنا حاوی تھا کہ وہ الجزائر کو فرانس کے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ اس سلسلہ میں وہ حقیقت پسند نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے عوام کو سمجھنے اور الجزائر کی خواہشات کو سمجھنے سے انکاری تھا۔ نسلی تصادم سے دونوں طرف کے عوام کو جو زخم آئے انہیں سمجھنے سے بھی اسے انکار تھا۔ اس طرح ظالم اور مظلوم دونوں مسخ ہوجاتے ہیں۔ الجزائر ابھی تک اس مسخ تشخص کے ساتھ لڑ بھڑ رہا ہے۔ چنانچہ فرانس کے لئے یہ بڑی عجیب صورت ہے۔ یہ محض حادثہ نہیں کہ فرانس کو ژاں ماری لا پاں کی فسطائی تحریک بھی چیلنج کررہی ہے اور نیشنل فرنٹ غیر متوقع طور پر فرانسیسی معاشرے میں طاقت پکڑ رہا ہے۔ الجزائر ایک طرف اسلام ازم اور دوسری طرف فوجی طالع آزماؤں کے سبب سے ابتلاء سے دوچار ہے۔

س: آپ نے 1960ء کے اوائل میں تین برس الجزائر میں بسر کئے؟

ج: شمالی افریقہ میں سارا وقت الجزائر میں نہیں کچھ وقت الجزائر میں کچھ وقت تیونس میں اور تھوڑا سا وقت مراکش میں گزرا۔ میرے خیال میں یہ سال سیاسی اعتبار سے میری فکری تعمیر

MashalBooks.org

کے لئے اہم ثابت ہوئے لیکن ذہنی تعمیر میں پرنسٹن سے کچھ زیادہ اہم نہیں۔ پرنسٹن یونیورسٹی دانشوری کے لحاظ سے زیادہ تعمیری تھی کیونکہ وہاں ایسے خیالات اور نظریات سامنے آئے جن کا مجھے مقابلہ کرنا پڑا جن پر ردعمل کا اظہار کرنا پڑا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ میرے اختلافی نقطۂ نظر نے پرنسٹن میں ہی ترقی پائی۔ یہ زمانہ امریکہ میں خطرناک دقیانوسیت کا زمانہ تھا جو ڈراتا تھا۔ مستشرقیت اپنی انتہا کو پہنچ رہی تھی جو بعض اعتبارات سے پُرخطر تھی اس عرصے میں امریکی تعلیمی اداروں میں علاقائی مطالعوں کو خاص اہمیت حاصل ہوئی جسے اب گلوبلائزیشن کے نام سے ختم کرنے کی کوشش کی جانے لگی ہے۔ وہ ایسا کر سکیں گے یا نہیں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

محفوظ پناہ گاہ قبول نہ کرو

س: ہندوستان کو برطانوی سامراج کے قبضے میں جانے کے عظیم مخالف ٹیپو سلطان تھے انہیں بالآخر برطانیہ نے 1799ء میں شکست دی۔ اصل میں یہ شکست انہیں آرتھر ولزلی کے ہاتھوں ہوئی جو بعد میں ڈیوک آف ولنگٹن بنا۔ اس نے نپولین کو شکست دی اس کے بعد 1857ء تک، جب جنگ آزادی شروع ہوئی کوئی بڑی مزاحمت نہ ہوئی۔ ٹیپو سلطان نے اپنی شہادت کے وقت اپنے بیٹوں کو جو نصیحت کی اقبال نے اس نصیحت کو اشعار کا قالب دیا ہے۔

ج: اس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ آپ اپنی مرضی سے مصروف گل گشت رہیں کوئی محفوظ پناہ گاہ قبول نہ کریں۔ اگر لیلیٰ بھی محمل میں موجود ہو تو اس محمل میں سوار نہ ہوں۔ یہ لیلیٰ مجنوں کی حکایت محبت کی طرف اشارہ ہے۔ مجنوں لیلیٰ سے ملنے کے لئے اس درجہ بے تاب ہے کہ ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے۔ لیلیٰ حسن کا پیکر ہے زندگی کی آسائش وآرام کی علامت ہے اس کا قرب دنیاوی مادی وسائل کے حصول کی علامت ہے۔ شاعر نے مجنوں سے کہا ہے کہ اگر لیلیٰ بھی محمل میں موجود ہو تو اس میں سوار نہ ہو۔

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند وتیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جاصنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز، گرمی محفل نہ کر قبول
صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جوعقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول
باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کرقبول

س: لگتا ہے کہ بعض صورتوں میں آپ بھی مادی، دولت، شہرت اور قبولیت کے لالچ کو خاطر میں نہیں لائے۔

ج: آپ نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے اُن کے لئے میں شکرگزار ہوں۔ میں حصول مسرت کے ضمن میں حریص ہوں۔ میں بہت خوش باش آدمی ہوں۔

س: میں روحانیت کے حوالے سے بات کرتا ہوں۔

ج: میں جانتا ہوں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں نے کوئی قربانی نہیں دی۔ میں نے جو کچھ کیا اپنے فائدے کے لئے کیا۔ میرے پاس بہت کچھ نہیں تاہم میں خوش ہوں۔

س: تیسری دنیا اور امریکہ میں بہت سے لوگ آپ کی طویل جدوجہد کے مداح ہیں۔

ج: لوگ بہت مہربان اور محبت کرنے والے ہیں۔

س: اکتوبر 1997ء کے شروع میں ہمپشائر کالج میں آپ کے اعزاز میں جو تقریب ہوئی وہ حقیقتاً غیر معمولی تقریب تھی۔ آپ کے اکثر ساتھی دنیا بھر اور امریکہ سے آئے ہوئے تھے۔ آپ کے دوست نوم چومسکی، ہاورڈ زن، ایڈورڈ سعید اور دوسرے آپ کے استقلال واستقامت اور مقصد سے وابستگی کے قائل اور معترف تھے۔

ج: یہ واقعی خوش کن تقریب تھی، اثرانگیز تقریب تھی اور دلچسپ، میں نے یونیورسٹی آف کولوریڈو میں کل رات لیکچر دیا تو میرے کئی طلبا میلوں دور سے اس تقریب میں شرکت کے لئے آئے۔ ان میں سے کئی ایک تو اپنے والدین کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ دو تو اپنی محبوباؤں کو بھی لائے تھے۔ ایسا ہمیشہ ہوتا ہے۔ پرانے دوست اور طلبا آپ کو یاد رکھتے ہیں اور آپ ان کی یادوں کو۔

س: میرا خیال ہے آپ بے شمار لوگوں کے محبوب ہیں۔

ج: یہ میرے لئے انتہائی مسرت کی بات ہے۔

MashalBooks.org

حوالے

1۔ ایڈورڈ سعید The Pen and the Sword -1994

2۔ ٹم وائنر Raids Are Seen As One Battle in a Long Fight نیویارک ٹائمز 23 اگست 1998

3۔ اقبال احمد Terrorism: Theirs and Ours 12۔ اکتوبر 1998

4۔ دیکھئے اقبال احمد اور رچرڈ بارنٹ کا مضمون Reporter At Large نیویارکر 11 اپریل 1998

5۔ رچرڈ ہیلورین U.S. May Establish Afghan Rebel نیویارک ٹائمز 18 جون 1986

6۔ دیکھئے جیمز ریزن To Bomb Sudan Plant نیویارک ٹائمز 27۔ اکتوبر 1999

7۔ اقبال احمد کا انٹرویو The Progressive 11۔ نومبر 1998

8۔ دیکھئے ادریس شاہ Sufism 1971

9۔ کلیات اقبال

10۔ کلیات اقبال

11۔ اقبال احمد The Neo-Fascist State رسالہ عرب سٹڈیز کوارٹری۔ نمبر۔2۔ 3

12۔ تسلیمہ نسرین کا ناول ''لجا'' 1997

13۔ دیکھئے ڈیکسٹر فلکنز Writer Risks Threats لاس انجلیز 13۔ نومبر 1998

14۔ سوزین گولڈنبرگ Pakistani PM to Impose Sharia اخبار گارڈین 29۔ اگست 1998

15۔ پال فیریلی اور جوتھن کالورٹ Pakistan PM Probed over Secret Fortune بزرور 27 ستمبر 1998

16۔ باربرا کروسٹ New Delhi Pledges to Sign CTBT نیویارک ٹائمز 25 ستمبر 1998

17۔ دیکھئے رابرٹ فسک Curfew Shields Forces of Darkness اخبار انڈی پینڈنٹ 19 جولائی 1993

MashalBooks.org

18۔ دیکھئے رابرٹ فسک One Candle in the Heart of Darkness انڈی پینڈنٹ
27۔اکتوبر 1996

19۔ دیکھئے لارا سلمبر اور ایلین لٹل Yogoslavia 1997۔

20۔ دیکھئے۔فلپ گوروچ We Wish to Inform You 1961

21۔ فرائیڈ Civilization and its Discontent

22۔ وندنا شیوا Recovery of the Commons

23۔ دیکھئے وندنا شیوا۔

24۔ انتونیو گرامچی انتخاب Prison Notebooks

25۔ کاموس Neither Victims Nor Executioners

26۔ کلیات اقبال۔

MashalBooks.org

اقبال احمد کے منتخب مضامین

I964. "Trade Unionism." *In State and Society in Modern North Africa* Ed. Carl Brown. Washington, D C: The Middle East Insti tute.

December I964. "Tunisia's Trade Unions." *African Studies Bulletin* _ Volume 7, Number 4, pp. 13ff.

August 30, I965. "Revolutionary Warfare: How To Tell When the Rebels Have Won." *The Nation*. Volume 201, Number 5, pp. 95-1 00. Reprinted in *Revolutionary Warfare: How To Tell When The Rebels Have Won*.' Boston: New England Free Press, I965. Also printed in *Vietnam: History, Documents and Opinions On A Major World Crisis*. Ed. Marvin E. Gettleman. Greenwich: Fawcett Premier, I965, Pp. 351-62.

1966. "Trade Unionism In The Maghreb." In *State And Society In Independent North Africa.* Ed. L. Carl Brown. Washington, D C: Middle East Institute.

I968. Dialogue with Samuel P. Huntington et al. In *No More Vietnams? The War And The Future of the American Polity* . Ed. Richard M. Pfeffer. New York: Harper And Row.

January 29, 1968. "Primer For Revolutionary Guerrillas." *The Nation*. Volume 206, Number 5, pp. 149-153.

July-August 1968. "Radical But Wrong." *Monthly Review*. Volume 20, Number 23, pp. 70-83. Reprinted in *Régis Debray and the Latin American Revolution* . Eds. Paul Sweezy And Leo Huberman. New York: Monthly Review Press, 1969, Pp. 70-83.

March 3, 1969. "America As Superpower: How We Look To The Third World." *The Nation*. Volume 208, Number 9, pp 265-269.

MashalBooks.org

1971. Foreword to *The June 1967 Arab-Israeli War: Miscalculation Or Conspiracy?* Ed. Samo Elias. Wilmette, Illinois: Medina University Press.

1971. "Revolutionary Warfare and Counterinsurgency." In *National Liberation: Revolution in the Third World.* Eds. Norman Miller And Roderick Aya. New York: Free Press, Pp. 137-213.

February 1971. "Theories of Counterinsurgency." *Bulletin of Concerned Asian Scholars.* Volume 3,-Number 2, pp. 76-80.

August 2, 1971. "Winning Hearts and Minds: The Theory and Fallacies of Counterinsurgency." *The Nation*. Volume 213, Number3_, pp. 70-85.

September 2, 1971. "Letter to a Pakistani Diplomat." *The New York Review of Books*. Volume 17, Number 3.

Winter 1972. "Notes on South Asia in Crisis.' *Bulletin of Concerned Asian Scholars*. Volume 4, Number 1, pp. 23-29.

February 1972. "Speaking Truth to Power: An Interview with Daniel Ellsberg, Tony Russo, and Eqbal Ahmad." Interview by Studs Terkel. *Harper's Magazine*. Volume 244, Number 1461, pp. 52ff.

July 1973. "South Asia in Crisis And India's Counterinsurgency War Against The Nagas And Mizos." *Bulletin of Concerned Asian Scholars* . Volume 5, Number 1, Pages 25-36.

1974. "Pakistan: Signposts To A Police State." *Journal of Contemporary Asia* . Volume 4, Number 4.

March 'I974. "America and Russia In South Asia: Conflict or Collusion?" *Bulletin of Concerned Asian Scholars* . Volume 6, Number l, pp. 22-27.

1975. "The Economic Implications of U.S. Foreign Policy." With Cyril E. Black et al. Sound recording. Santa Barbara: California Center for the Study Of Democratic Institutions.

1975. "A World Restored' Revisited: Amer ican Diplomacy in the Middle East." In *Middle East Crucible: Studies on the Arab-Israeli war of October 1973* . Ed. Naseer H. Aruri. Wilmette, Illinois: Medina University Press.

Winter 1978. "M'hamed Ali And The Tunisian Labor Movement. With Stuart Schaar. Race and Class. Volume I9, Number 3, pp.253-76.

1978. "Indictment for Conspiracy to Murder Orlando Letelier." *Race and Class*. Volume 19, Number 3.

May 1978. "Human Rights in Morocco and Tunisia". With Stuart Schaar. *Merip Report.* Volume 8, Number 4. ,

Summer 1979. ,"The Iranian Revolution." *Race and Class*. Volume 21, Number

MashalBooks.org

L, pp. 3-11.

1980. Eqbal Ahmad, "Political Culture And Foreign Policy: Notes On 'American Interventions in the Third 'World." In *For Better or Worse: The American Influence in the World.* Ed. Allen Freeman Davis. Westport, Connecticut: Greenwood Press, pp.119-31.

March 3, I980. "Iran and the West: A Century of Subjugation. *Christianity and Crisis.* Volume 40, Pp. 37-44.

Summer I980. "A Perspective From The Third World on War and Its Abolition." Interviewed By Virginia Heiseman. *Race and Class*. Volume 22, Number L, pp. 77-81.

Summer 1980. "From Potato Sack To Potato Mash: The Contemporary Crisis of the Third World." *Arab Studies Quarterly*. Volume 2, Number 3, pp. 223ff.

Summer 1980. "The Question Of Palestine" Review of Edward W. Said, *The Question Of Palestine. Race and Class.* Volume 22, Number I, pp. 85-91.

Autumn 1980. "Pakistan In Crisis: An Interview with Eqbal Ahmad." *Race and Class.* Volume 22, Number 2, Pp. I29-46.

Fall I980. "Post-Colonial Systems of Power." *Arab Studies Quarterly*. Volume 2, Number I, pp, 35 0ff.

Spring 1981. "The Neo-Fascist State: Notes on the Pathology of Power in the Third World." *Arab Studies Quarterly*. Volume 3, Number 2, pp. 170-80.

1982. "Rentier State and Shia Islam in the Iranian Revolution —Comments." *Theory and Society*. Volume II, Number 3, pp.293-300.

March 1983. "The Public Relations O of Ethnocide." *Journal of Palestine Studies.* Volume I2, pp. 31-40. .

Spring 1983. "Introduction" In *The Invasion of Lebanon*. Special Double Issue'. of *Race and Class*. Eds. Eqbal Ahmad and Ibrahim Abu-Lughod Volume 24,. Number 4, pp. I-VIII.

Spring 1984. "'Pioneering' in the Nuclear Age: An essay on Israel and the Palestinians." *Race and Class*. Volume 25, Number 4, pp. 1-20.

1984. "Islam and Politics." In *Islamic Impact.* Eds. Yvonne Yazbeck Haddad, Byron I-Iaines, And Ellison Banks Findly. New York: Syracuse University Press, pp. 7-26.

1985. "Cracks in the Weste rn World (view)." *Radical America.* Volume 19, Number 1", pp. 37-46.

1985. "Islam And Politics." In *Islam, Politics, and the State: The Pakistan Experience. Ed.* Mohammad As ghar Khan. London: Zed Books.

September 21, 1985. "Only as Good as Its Members." *The Nation.* Volume.241, Number 8, pp. 242-44.

May-June 1986. "Comprehending Terror." *Middle East Report.* Volume 16, Number 3, pp. 3-5.

April 11, 1988. "A Reporter At Large: Bloody Games." With 'Richard J. Barnet. *New Yorker,* Pp. 44-86.

May-June 1989. "Middle East Peace Priorities In The U S: Seven Perspectives." With Noam Chomsky et al. *Middle East Report.* Volume 19, Number. 3.

July 1990. "Kashmir and Its Challenges." *Pakistan Horizon.* Volume 43, Number 3, pp. 11-20.

August 1990. "An Era of Grief: United States Policy in the Middle East Created A Power Vacuum that Saddam Hussein Has Moved To Fill." *New Statesman and Society.* Volume 3, pp. 12-13.

1991. "What Arabs Know, and You Don't." *In Gulf War: Views from the Other Side.* Manila: Socio-Pastoral Institute.

1991. "Portent of a New Century." In *Beyond the Storm: A Gulf Crisis Reader.* Eds. Phyllis Bennis And Michel Moushabeck. Brooklyn: Olive Branch Press.

March-April 1991. "Nightmare Victory?" Mother Jones. Volume, 16, 'Number 2, pp. 4-7.

March 17, 1991. "The Hundred-Hour War." *Dawn.* Volume 50, Number 76, P 11.

June 1991. "Soul Struggles," *New Statesman and Socie ty.* Volume 4, Pp. 23-24.

1993. "Racism And the State: The Coming Crisis of U.S.-Japanese Relations." In *Japan in the World*. Eds. Masao Miyoshi And H.D. Harootunian. Durham: Duke UP, pp. 40-48.

1993. "M'hamed Ali: Tunisian Labor Organizer.' *In Struggle and Survival In the Modern Middle East.* With Stuart Schaar. Ed. Edmund Burke III. Berkeley: UC Berkeley Press, Pp. 253-76. Revised version of article from *Race and Class*, Winter 1978.

Summer 1993. "At the Cold War's End: A World of Pain." *Boston Review*. Volume 18, Numbers 3-4.

1994. Introduction to *The Pen and The Sword: Conversations with Edward W. Said.* Ed. David Barsamian. Monroe, Maine : Common Courage Press.

June 8, 1997. "Culture of Imperialism." *Dawn.* Volume 50, Number 152, p 13.

September 23, 1997. "Algeria's Unending Tragedy." *Dawn.* Volume 50, Number 257, p. 13.

MashalBooks.org

February 2, 1998. "Feudal Culture and Violence (Roots of Violence in Pakistan) II." *Dawn*. Volume 52, Number 31, P. 13.

Spring 1998. "Jihad International, Inc." *Covert Action Quarterly*. Number 64, pp. 29-32

May 17, 1998. "India's Obsession, Our Choice." Dawn. Vol ume 52, Number 130, p. 13.

June 6, 1998. "Reason as Spectator." *Dawn.* Volume 52, Number 151, p. 13.

June 28, 1998. "No Alternative to Dialogue." Dawn. Volume 52, Number 172, p. 13.

June 29, 1998. "Fire on the Mountain." *The Nation.* Volume 266, Number 23, p. 6.

August 27-September 2, 1998. "A Mirage Mis- named Strategic Depth. "*Al-Ahram Weekly* (Egypt).

September 21, 1998. "Missile Diplomacy." *The Nation.* Volume 267, Number 8, p. 29.

November 5-11, 1998. "After the Peace of the Weak." *Al-Ahram Weekly* (Egypt). Number 402.

1999. "When Mountains Die." In Pakistan-India Nuclear Peace Reader. Lahore, Pakistan: Mashal, pp. 8-13.

MashalBooks.org

Mashal is a small organisation dedicated to the publishing of books on social, cultural and developmental themes of contemporary relevance. Trends in modern thought, human rights, the role of women in development, issues of governance, environmental problems, education and health, popular science, drugs and creative literature relating to these and other themes are the focus of Mashal's programme.

While Mashal works for the widest dissemination of its publications, it is a non-commercial and non-profit enterprise. Mashal therefore seeks the support of individuals and aid giving agencies, worldwide which consider the foregoing objectives worthy of promotion.

مشعل معاشرتی، معاشی اور ثقافتی امور اور عہد حاضر سے متعلق ترقیاتی موضوع پر کتابیں شائع کرتا ہے۔ جدید فکری رجحانات، انسانی حقوق، بہتر نظم و نسق، ترقی میں خواتین کے کردار، ماحولیات، منشیات اور قومی و عالمی تخلیقی ادب مشعل کی خصوصی توجہ کا مرکز ہیں۔

مشعل کی کوشش ہے کہ اس کی مطبوعات وسیع پیمانے پر دستیاب ہوں۔ یہ ایک غیر تجارتی اور غیر نفع مند ادارہ ہے۔ چنانچہ مشعل ایسے پاکستانی اور غیر ملکی اداروں اور افراد سے امداد کا خواہاں ہے جو مشعل کے اغراض و مقاصد سے اتفاق رکھتے ہوں۔

MashalBooks.org

EQBAL AHMAD
CONFRONTING EMPIRE
INTERVIEWS BY DAVID BARSAMIAN

(SAAMRAJ KAY MUQABIL)

Urdu Translation: Hameed Jehlami

Copyright (c) Urdu 2001 Mashal

'(c) David Barsamian 2000 CONFRONTING EMPIRE first published by Pluto Press, 2000. Foreword (c) Edward Said 2000. This Translation is published by arrangement with Pluto Press Ltd., London'.

Publisher: **Mashal**
RB-5, Second Floor,
Awami Complex, Usman Block, New Garden Town,
Lahore-54600, Pakistan

Telephone & Fax: 042-35866859
E-mail: mashbks@brain.net.pk

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org